آخری تحفہ

پریم چند

(برائے طلبا)

بی اے، بی ایس سی، بی کام (عثمانیہ یونیورسٹی)

(مُرتب و تخلیص کار)

تنویر پبلیکیشنز حیدرآباد دکن نمبر ۲

قیمت دو روپے

فہرست مضامین

	صفحہ نمبر
۱۔ پریم چند کے افسانے	۳
۲۔ آخری تحفہ	۱۱
۳۔ قاتل	۱۹
۴۔ ادیب کی عزت	۲۴
۵۔ دو بیل	۳۰
۶۔ جیل	۳۶
۷۔ شکار	۴۰
۸۔ آخری حیلہ	۴۶
۹۔ ستی	۵۰
۱۰۔ طلوع محبت	۵۵
۱۱۔ وفا کی دیوی	۶۱
۱۲۔ ڈیمانسٹریشن	۷۲
۱۳۔ برات	۷۶
۱۴۔ نجات	۸۰
۱۵۔ سوالات وجوابات	۸۶

پریم چند کے افسانے

پریم چند افسانوی ادب کے سب سے پہلے معمار ہیں ان سے قبل افسانہ نویسی کا رواج نہ تھا۔ اگرچہ ان سے قبل پنڈت رتن ناتھ سرشار افسانوی انداز کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ اور "افسانہ آزاد" میں غدر کے بعد لکھنوی تہذیب کے زوال کا نقشہ نہایت دلکش انداز میں پیش کر چکے تھے۔ مگر "فسانہ آزاد" دراصل برائے نام فسانہ ہے۔ وہ ایک غیر مربوط ناول یا داستان زیادہ ہے اور افسانہ کم ہے اس میں افسانہ کی کوئی ٹکنیک نہیں ہے۔ صرف انداز بیان افسانوی ہے حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں افسانہ انگریزی کی وساطت سے آیا اور اس نے اس وقت جنم لیا جب ہندوستان سامراجی بیڑیوں سے جکڑا ہوا تھا اور جب ہر طرف ایک قسم کا سیاسی، سماجی، اقتصادی اور اخلاقی انتشار پھیلا ہوا تھا۔ پریم چند نے اس نفرت کو محسوس کیا اور اس کو دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے افسانے کو اپنے نظریہ کا آلۂ کار بنایا۔

دراصل پریم چند ہندوستان کی آزادی کے نقیب تھے۔ ہندوستان کی بیداری اور آزادی میں ان کا زبردست ہاتھ ہے، ہندوستان حصول آزادی میں جس جادۂ منزل سے گذرا ہے اس کے نقش پا پریم چند کے افسانوں ہی میں ملتے ہیں۔ پریم چند کے افسانوں میں انقلاب کے قدموں کی آہٹ آزادی

کے نعروں کی گونج اور دم توڑتے ہوئے سپاہیوں کی للکار صاف سنائی دیتی ہے۔

پریم چند کے حب الوطنی کے افسانوں کا آغاز ۱۹۰۶ء سے ہوتا ہے اس کے قبل لارڈ کرزن کے عہد میں بنگال تقسیم ہو گیا تھا۔ بنگالی اس تقسیم کے خلاف تھے پریم چند کو بھی یہ بٹوارہ پسند نہ آیا اور وہ بھی بنگالیوں کی صدائے احتجاج سے متاثر ہوئے اور اسی عہد سے انگریزوں کی پالیسی کے خلاف ہو گئے انھوں نے ۱۹۰۶ء میں "دنیا کا سب سے انمول رتن" افسانہ لکھا۔ اس میں انمول رتن، خون کے اس قطرہ کو کہا ہے جو وطن کی راہ میں بہایا جائے ۱۹۰۹ء میں پریم چند نے "سوزِ وطن" کے نام سے پانچ افسانوں کا مجموعہ شائع کیا اور "سوزِ وطن" پر حکومتِ وقت کا عتاب نازل ہوا۔ اس سختی کے باوجود پریم چند انگریزوں کے خلاف افسانے لکھتے رہے اسی دوران میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ پیش آیا۔ اس کے ساتھ ہی گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کا بھی زور بڑھتا گیا۔ پریم چند ان حالات سے متاثر ہوئے اور ۱۹۲۰ء میں سرکاری ملازمت سے استعفاء دے دیا اور اب وہ زیادہ سرگرمی کے ساتھ سیاسی افسانے لکھنے لگے ہندوستان کی تحریک آزادی کو پریم چند کے افسانوں سے کافی قوت پہنچی۔ پریم چند کے افسانوں کے بہت سے پلاٹ ہندوستان کی تحریک آزادی سے وابستہ ہیں اس لحاظ سے ان کے پلاٹ کافی اہم ہیں۔

بعض اوقات پریم چند اپنے پلاٹ کیلئے سنگ و خشت راجپوتوں کی خستہ اور پامال عمارت سے حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بعض افسانوں میں ہندو گھرانوں کی قدیم عظمت کو بلند کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ان کو اپنا بھولا ہوا افسانہ پھر سے یاد دلایا ہے جس طرح حالی نے "مسدس حالی" لکھکر مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا اس لحاظ سے پریم چند اور حالی دونوں ایک ہی کشتی کے ناخدا ہیں اور دونوں نے یکساں طور پر ڈوبتی ہوئی قوم کو بچانے کی کوشش کی ہے دراصل

ان دونوں کے یہاں تنقید حیات بھی ملتی ہے اور ترغیب عمل بھی۔

پریم چند کے سب سے زیادہ پلاٹ وہ ہیں جن میں ہندوستان کے کسانوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ پریم چند نے کسانوں کو ان کی گہری نیند سے بیدار کیا اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کی آبادی کا بیشتر حصہ دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ اگر دیہات کے باشندے بیدار ہو جاتے ہیں تو ہندوستان کی بیداری یقینی ہے۔ وہ زمیندار، تحصیلدار، پٹواری، پیادے، چوکیدار، جج، وکیل اور ڈاکٹر سب کو کسانوں کا دشمن سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں یہ لوگ غریبوں کی لاش کو نوچنے والے گدھ تھے۔ دراصل وہ ایک ایسے نظام کی تشکیل کے خواہشمند تھے جس میں مساوات و یکسانیت کا بول بالا ہو۔ جہاں افلاس، و امارت کا فرق باطل نظر آئے جہاں کسان، مزدور اور سماج کے دیگر افراد خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کرسکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند پہلے ادیب ہیں جنھوں نے عوام کے دکھتے ہوئے دلوں پر ہاتھ رکھا ہے اور اپنے افسانوں کے ذریعہ عوامی مسائل کا حل پیش کیا ہے پریم چند کا اصل ہیرو ڈرائنگ روم اور شبستان کی مہکی ہوئی فضاء کا انسان نہیں ہے بلکہ کھیت اور کھلیان کی جھلسا دینے والی دھوپ کا کسان ہے بعض اوقات پریم چند پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے افسانوں کا دائرہ بہت تنگ اور محدود ہے۔ کیونکہ وہ کسانوں کے حدود سے آگے نہیں بڑھتے ہیں۔ اس کوئی شک نہیں کہ پریم چند نے زیادہ تر ہندوستان کے کسانوں کا حل پیش کیا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حق و باطل کی جنگ ہے۔ اور یہ جنگ ہر ملک میں جاری ہے اس لئے پریم چند کے افسانے مقامی ہونے کے باوجود آفاقی ہیں۔ دراصل ان کے مسائل عوامی ہونے کی وجہ سے عالمی بن گئے ہیں اس لئے پریم چند کے افسانوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

پریم چند فطرت کے صحیح نباض ہیں وہ انسانی جذبات کا صحیح طور سے تجزیہ

کر سکتے ہیں۔ انھوں نے بچے بوڑھے، جوان، مرد، عورت، بیوہ اور سہاگن امیر و غریب غرضکہ سب ہی کی زندگی کی عکاسی صحیح طور پر کی ہے۔ وہ دوسروں کی دھڑکنوں کو اپنے دل میں محسوس کر لیتے ہیں، اس لئے وہ ایک نفسیاتی انداز میں اپنے کرداروں کے عادات و خصائل کو پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں ان کے یہاں رنج و راحت یاس و امید، تعجب و حیرت، غصہ و نفرت، پیار و محبت، رغبت و رقابت اور دیگر جذبات کی تحلیل ایک نفسیاتی انداز میں ملتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند کے افسانوں میں رومان کی کمی ہے اس کا کافی سبب یہ ہے کہ ان کے افسانوں کا مقصد قوم کی اصلاح ہے۔ اسلئے ان افسانوں کی بنیاد جنسیات پر نہیں ہے یہی سبب ہے فرائڈ کے نظریات میں ان کو کوئی کشش نظر نہ آئی پریم چند کے یہاں ہلکا پھلکا رومان، سطحی محبت اور جنسی ترغیب نہیں ملتی مگر جہاں تک پاکیزہ محبت اور انسانی خلوص کا تعلق ہے۔ ان کے افسانے ان عناصر سے محروم نہیں ہیں ان کے افسانوں کی فضاء میں انسان دوستی کے عام جذبات کی کرنیں بکھری ہوئی ہیں۔

پریم چند کے کرداروں میں ایک خاص بات اور بھی ہے چونکہ وہ انسانی جذبات کے صحیح ترجمان ہیں اس لئے ان کے کردار نہ رحمن ہوتے ہیں نہ شیطان بلکہ انسان ہوتے ہیں۔ ان میں خوبیاں اور خامیاں دونوں پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ پریم چند کے افسانوں کا مقصد اصلاح ہوتا ہے اس لئے وہ عموماً مثالی کرداروں کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں اس کے علاوہ پریم چند کے یہاں نہایت سلیقہ سے کردار کے ارتقاء اور کردار کا اضطراب بھی ملتا ہے پریم چند کے افسانوں میں کشمکش اور منتہا بھی بہت مناسب موقع سے ملتے ہیں۔

پریم چند کے افسانے لکھنے کا انداز بہت ہی منظم اور دلفریب ہے وہ تفصیل میں بھی جاتے ہیں اور کرداروں کے نشو و نما کی طرف بھی توجہ کرتے ہیں۔

آخر آخر میں پریم چند اصلاح پسند سے ترقی پسند ہو گئے تھے اپنے انتقال سے کچھ سال پہلے جو افسانے انھوں نے لکھے ہیں ان میں حقیقت نگاری کی گہری لہر نظر آتی ہے اس کے لئے ان کا افسانہ "کفن" بہت مشہور ہے۔

پریم چند نے اردو افسانے کو ایک واضح شکل دی اور ابتدائی زمانے میں اسکو حب وطن، مقامی رنگ، دیہاتی زندگی اور انسانی فطرت کا ایسا کامیاب ترجمان بنا دیا کہ کسی صنف کو بھی ابتدائی منزل میں ایسی کامیابی نصیب نہیں ہوئی جب پریم چند نے افسانے لکھنا شروع کیا تھا تو ان کے ساتھ دس پانچ ایسے افسانہ نگار تھے جنھیں انہیں کے درجہ کا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج پریم چند کی ذات نہ صرف ان ہی دس بارہ میں بلکہ اردو کے تمام افسانہ نگاروں میں منفرد اور ممتاز ہے۔

پریم چند کا مشاہدہ وسیع تھا۔ انسانی نفسیات پر ان کی نظر گہری تھی اور انہوں نے اپنے زمانے کے سماجی مسائل کو جس خوبصورتی سے الفاظ کا جامہ پہنایا وہ تصویر کشی سے بڑھ کر فنکاری کے درجہ تک پہنچ گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پریم چند کے مرجانے کے بعد بھی انکا فن زندہ ہے اور ان کا نام درخشاں ہے۔

پریم چند نے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ وہ مختلف حالات میں ان کے مختلف جذبات سمجھ سکتے ہیں۔ اور اپنی اس سمجھ کی بدولت جب وہ افسانوں میں واقعات بیان کرتے ہیں تو ان کے کرداروں میں زندگی سانس لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مکالموں کی خوبی اور جملوں میں کہیں کہیں پر مزاح پیدا کر کے وہ حقیقت کی ایسی تصویر کھینچ دیتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو تمام واقعات اپنی نظروں کے آگے گزرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

افسانہ نگار کے فن کی سچائی یہ ہے کہ کردار خود سے چلتے پھرتے معلوم

ہوں اور یہ محسوس نہ ہوں کہ لکھنے والا انہیں ڈھکیل رہا ہے۔ پریم چند کے کردار خواہ مرد ہوں یا عورت جوان ہوں یا بوڑھے۔ امیر ہوں یا غریب اپنے درجے اور حیثیت کے مطابق کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے پریم چند کی انسانی نفسیات سے گہری واقفیت کا اور یہی پریم چند کے افسانوں کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

زبان اور بیان پر پریم چند کو جو عبور حاصل ہے، محاوروں کی نشست جملوں کی ساخت میں ان کے یہاں جو مضبوطی ہے وہ ان کو اہل زبان کے درجے تک پہنچاتی ہے زبان خیالات کی ترجمانی کا ایک آلہ ہے۔ جس پر بہت کچھ مشاہدہ کرنے والے کی کامیابی کا دارومدار ہے اپنے خیالات اور احساسات اگر افسانہ نگار مہارت سے نہ لکھ سکے تو اس کا مشاہدہ کامیابی سے پڑھنے والوں تک نہیں پہنچ سکتا پریم چند کے بعد اردو افسانہ نگاروں کا جو گروہ آیا وہ معلوم نہیں کیوں الفاظ کی مناسبت اور زبان کی درستی کی طرف سے بے پرواہ ہوگیا۔ اس وجہ سے پریم چند کی مضبوط ڈھلی ہوئی زبان اور ان کے افسانوں کا ضبط و نظم ان کے بعد کم ہی نظر آتا ہے۔

آخری تحفہ

افسانوں کا خلاصہ

از

پریم چند

مرتب و تلخیص کار

تنویر پبلیکیشنز حیدرآباد دکن۔ اے۔ پی

زندگی میں ادب کا مقام

ادب کا انحصار زندگی پر ہے۔ اسی نیو پر ادب کی دیواریں کھڑی ہوتی ہیں۔ زندگی خدا کی تخلیق ہے۔ اس لئے لامتناہی ہے، نارسا ہے، جامع ہے ادب انسان کی تخلیق ہے اسی لئے یہ قابل فہم ہے۔ متحرک ہے اور ضابطوں کا پابند ہے۔ زندگی کو اپنے فعلوں کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہونا پڑیگا یا نہیں، ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن ادب تو انسان کے سامنے جواب دہ ہے اس کے قانون ہیں جن سے وہ ادھر ادھر نہیں ہو سکتا زندگی کی غایت یا مقصد ہی مسرت ہے۔ انسان زندگی بھر مسرت ہی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ کسی کو یہ زر و جواہر میں ملتی ہے کسی کو بھرے پرے خاندان میں کسی کو لمبے چوڑے محل میں کسی کو عیش پرستی میں، لیکن ادب کی خوشی اس خوشی سے برتر ہے اس سے مقدس ہے۔ اس کی بنیاد حسن اور سچائی ہے۔ حقیقت میں سچی خوشی حسن اور سچائی ہی سے ملتی ہے۔ اسی خوشی کو ظاہر کرنا اور اس کی تخلیق کرنا ادب کا مقصد ہے۔ عیش پرستی اور کام جوئی میں ایک طرح کی بے اطمینانی چھپی ہوتی ہے اس سے نفرت بھی ہو سکتی ہے اور اس کے لئے ہم پچھتاوا بھی محسوس کر سکتے ہیں پر حسن کے ذریعہ جو خوشی ملتی ہے وہ بیکراں اور غیر فانی ہے۔

پریم چند

آخری تحفہ

سارے شہر میں صرف ایک ایسی دکان تھی جہاں ولایتی ریشمی ساڑھی مل سکتی تھی۔ اور سب ہی دوکانداروں نے ولایتی کپڑے پر کانگریس کی مہر لگا لی تھی مگر امرناتھ کی محبوبہ کی فرمائش تھی۔ اس کی تعمیل ضروری تھی۔ وہ کئی دنوں تک شہر کی دکانوں کا چکر لگاتے رہے دگنا دام دینے پر تیار تھے لیکن کہیں مقصد پورا نہ ہوا اور محبوبہ کے تقاضے شدید سے شدید تر ہوتے جاتے تھے کیونکہ ہولی کا تہوار بالکل قریب تھا۔ اور ساڑھی کی ضرورت تھی اور وہ بھی ولایتی ریشمی ساڑھی کی آخر کار امرناتھ ایک خاص دکان پر گئے اس دکان پر دھرنا دیا جا رہا تھا تماشائیوں کا ہجوم بھی تھا۔ امرناتھ قومی جذبات سے عاری نہ تھے جتی الامکان سودیشی چیزیں ہی استعمال کرتے تھے۔ مگر اس معاملے میں بہت راسخ نہ تھے سودیشی ملجائے تو بہتر ورنہ بدیشی ہی سہی اس اصول کے پیرو تھے۔ اور خاص کر جب ان کی محبوبہ کی فرمائش تھی تو انھوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ آج ساڑھی ضرور خریدینگے کوئی کسی کو کیوں روکے؟ کسی کو جبر کرنے کا کیا حق ہے؟ یہ بھی اچھی جنگ آزادی ہے جس میں شخصی آزادی کا اتنی بیدردی سے خون ہو۔ جب وہ دکان پر پہنچے تو پانچ رضاکار پکٹنگ کر رہے تھے اور دکان کے سامنے سڑک پر ہزار ہا تماشائی کھڑے تھے اتفاق سے ایک ملاقاتی پنڈت جی مل گئے ان سے پوچھا۔ کیوں جناب یہ دھرنا کب تک رہیگا؟ شام تو ہو گئی!

پنڈت جی نے فرمایا۔ ان سر پھروں کو صبح اور شام سے کیا مطلب جب تک دوکان بند نہ ہو جائے گی یہاں سے نہ ٹلیں گے کہیئے کچھ خریدنے کا ارادہ ہے

آپ تو ریشمی کپڑا نہیں خریدتے۔

امرناتھ نے کہا۔ میں تو نہیں خریدتا۔ مگر عورتوں کی فرمائش کو کیسے ٹالوں۔

پنڈت جی نے مسکرا کر کہا۔ واہ اس سے زیادہ آسان تو کوئی بات نہیں عورتوں کو کبھی چکر نہیں دے سکتے سو حیلے اور بہانے ہیں۔

امرناتھ نے کہا۔ آپ ہی کوئی حیلہ سوچیے۔

پنڈت جی جھٹ سے بولے۔ سوچا کیا ہے بھائی جان! عورتوں کا کام فرمائش کرنا ہے۔ مردوں کا کام اسے خوبصورتی سے ٹالنا ہے۔

امرناتھ نے کہا۔ آپ تو اس فن کے ماہر معلوم ہوتے ہیں دو ایک حیلے اور بہانے مجھے بھی بتایئے تاکہ میں بھی ان کو آزماؤں۔ پنڈت جی نے دو ایک بہانے امرناتھ کے سامنے پیش کیا۔ لیکن یہ بہانے انکو جچے نہیں اور کہنے لگے یہ آپ ہی کر سکتے ہیں میں نہیں کر سکتا۔

پنڈت جی بولے۔ اچھا تو آپ ایک کام کیجیے اس دکان کی پشت پر ایک دوسرا دروازہ ہے۔ ذرا اندھیرا ہو جائے تو ادھر سے چلے جایئے دائیں بائیں کسی طرف نہ دیکھیئے گا۔

امرناتھ نے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا اور جب اندھیرا ہو گیا تو پیچھے کی جانب سے دکان میں داخل ہوئے اور ایک قیمتی ساڑھی خریدی اور باہر نکلے تو ایک دیوی جی زعفرانی ساڑھی پہنے کھڑی تھی ان کی روح فنا ہو گئی لیکن دیوی جی کے چہرے کا رخ دوسری جانب تھا۔ امرناتھ اس موقع کو غنیمت جان کر دکان سے نکل گئے اور جلدی جلدی راستہ طے کرنے لگے۔ دفعتاً کانوں میں آواز "بابو صاحب ذرا ٹھہریئے گا۔" اور وہی زعفرانی کپڑوں والی دیوی جی آتی ہوئی دکھائی دیں۔

امرناتھ رک گئے جیسے کوئی ان کے پاؤں باندھ دیا ہو دیوی جی نے قریب آکر

کہا۔ آپ تو ایسا سمجھ گئے کہ میں گویا آپ کو کاٹ کھاؤں گی۔ آپ پڑھے لکھے آدمی اپنا فرض نہیں جانتے تو افسوس ہوتا ہے۔ ملک کی کیا حالت ہے لوگوں کو کھدر نہیں ملتا آپ ریشمی ساڑھیاں خرید رہے ہیں۔"

امرناتھ نے شرمندہ ہو کر کہا،" میں سچ کہتا ہوں دیوی جی میں نے اپنے لئے نہیں خریدا ہے۔ کسی کی فرمائش تھی۔

دیوی جی نے جھولی سے ایک چوڑی نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ایسے حیلے روز ہی سنا کرتی ہوں یا تو آپ اسے واپس کر دیجئے یا اپنا ہاتھ لائیے تاکہ میں آپ کو چوڑی پہنا دوں۔"

امرناتھ نے کہا شوق سے پہنا دیجئے میں اسے بڑے فخر سے پہنوں گا چوڑی اس قربانی کی ایک علامت ہے جو دیویوں کی زندگی کے لئے مخصوص ہے چوڑیاں ان دیویوں کے ہاتھ میں بھی تھیں جن کے نام سن کر آج بھی ہم تعظیم سے سر جھکاتے ہیں میں تو اسے شرم کی بات نہیں سمجھتا۔"

دیوی جی کو ان کی بے غیرتی پر حیرت تو ہوئی مگر وہ اتنی آسانی سے امرناتھ کو چھوڑنے والی نہ تھی۔ وہ بولی آپ باتوں کے شیر معلوم ہوتے ہیں اگر آپ دل سے عورت کو پرستش کی چیز مانتے ہیں تو میری یہ بات کیوں نہیں مانتے۔؟

امرناتھ نے جواب دیا اس لئے کہ یہ ساڑھی بھی ایک عورت کی فرمائش ہے اچھا چلئے میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ ذرا دیکھوں آپ کی دیوی جی کس مزاج کی عورت ہے

امرناتھ کا دل بیٹھ گیا اور وہ پریشان سا ہو گیا۔ کیونکہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ چونکہ نوجوان تھا۔ جذبات اور امنگوں کی دنیا آباد تھی۔ اور اپنی اس دنیا میں "مالتی" نامی ایک خوبصورت اور حسین لڑکی کو بسائے ہوئے تھا وہ اس راز چھپانے

کیلئے کہدیا۔ آج تو وہ ایک تقریب میں گئی ہوئی ہیں۔ گھر میں نہ ہوگی؟

دیوی جی نے پوچھا کل تو آجائے گی نا؟ تو آپ یہ ساڑھی مجھے دیدیجئے اور کل یہیں آجایئے گا میں آپ کے ساتھ چلوں گی میرے ساتھ دو چار بہنیں بھی ہوں گی؟

امرناتھ نے خودداری کے ساتھ کہا۔ اچھی بات ہے آپ اسے لے جائیں، اور پھر وہ گھر کی طرف چلدیئے۔

امرناتھ گھر جاکر ایک کھدر کی دکان پر گئے اور دو سو ٹوں کا کھدر خرید ا اور درزی کے پاس جاکر اس سے کہنے لگے اسے راتوں رات تیار کردو منہ مانگی سلائی دوں گا۔ درزی نے آدھی سلائی پیشگی لے لی اور تیار کردینے کا وعدہ کیا امرناتھ یہاں سے مطمئن ہوکر مالتی کی طرف چلے ان کے دل دماغ پر دیوی جی چھائی ہوئی تھیں اس دیوی کی آنکھوں میں متانت تھی وقار تھا۔ کتنا سچا جذبہ اور کتنی پرخلوص خدمت۔ اس کے سیدھے سادھے الفاظ میں کچھ ایسی تحریک عملی تھی کہ۔ امرناتھ کو اپنی نفس پرورانہ زندگی پر شرم آرہی تھی۔ اب تک کانچ کے ایک ٹکڑے کو ہیرا سمجھ کر سینہ سے لگائے ہوئے تھے آج انہیں معلوم ہوا کہ ہیرا کیسے کہتے ہیں۔ اس کے سامنے وہ ٹکڑا حقیر معلوم ہورہا تھا مالتی کی وہ جادو بھری چتون، اس کی نوخیز شیریں ادائیں، اس کی وہ شوخیاں اور سحر طرازیاں سب گویا ملمع اڑجانے کے بعد اپنی صورت میں نظر آرہی تھیں۔ اور امرناتھ کے دل میں ایک نفرت پیدا کررہی تھیں۔ وہ مالتی کی طرف جارہے تھے اس کے دیدار کے لئے نہیں بلکہ اس کے ہاتھوں سے اپنا دل چھین لینے کے لئے اور صرف وہ اس سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ کل دو گھنٹے کے لئے وہ ان کے گھر آئے تاکہ ان کی عزت کا بھرم کھل نہ جائے اور ان کو دیوی جی سے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے۔

جب وہ مالتی کے پاس گئے تو مالتی نے انہیں خالی ہاتھ دیکھکر کہا ساڑھی لائے

یا نہیں۔ امرناتھ نے بے نیازی کی شان سے کہا نہیں،

مالتی :۔ آخر کوئی وجہ ؟ روپے مجھ سے لے جاتے" اس پہ امرناتھ نے کہا،

تم خواہ مخواہ جلاتی ہو، تمہارے لئے میں جان دینے کو حاضر رہا"

تو شاید تمہیں روپے جان سے بھی زیادہ پیارے ہوں گے۔، مالتی نے کہا۔

امرناتھ اس کی طرف دلیرانہ انداز سے دیکھ کر کہا دکان پہ گیا ذلت اٹھائی مگر

ساڑھی لے کر چلا تو ایک عورت نے چھین لیا میں نے کہا میری بیوی کی فرمائش ہے

تو بولی میں انہیں کو دوں گی ۔ کل تمہارے گھر آؤں گی ۔

مالتی :۔ تم اتنے سادہ لوح ہو، مجھے معلوم نہ تھا ساڑھی دیکر چلے آئے

اب کل وہ آپ کو دینے آئے گی ۔ کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو"

امرناتھ :۔ خیر اسکا کل امتحان ہی ہو جائے گا ۔ ابھی سے کیوں بدگمانی کرتی ہو تم

شام کو ذرا دیر کیلئے میرے گھر تک چلی آنا ۔

مالتی ۔ جس سے آپ کہیں کہ یہ میری بیوی ہے ۔

امرناتھ ۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ میرے گھر آنے کیلئے تیار ہو جائیگی تو کوئی اور بہانا کر دیتا

مالتی :۔ تو آپ کی ساڑھی آپ کو مبارک ہو میں نہیں جاتی ۔

امرناتھ :۔ میں تو روز تمہارے گھر آتا ہوں ۔ تم ایک دن کیلئے بھی نہیں چل سکتی

تم میرے ساتھ بے انصافی کر رہی ہو ۔

مالتی رضامند ہو گئی اور وہ یہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ امرناتھ کی وفا میں کبھی بھی

لغزش نہ ہوگی ۔ لیکن اسکی خود کی زندگی ایک نام و نمود کی زندگی بن کر رہ گئی تھی

اور وہ ایسی زندگی گذارنے پر مجبور تھی ۔ ورنہ پھر اس کو اس تصنع اور بناوٹی

دنیا سے نکلنا پڑے گا ۔ اور اس فریبی دنیا سے منہ موڑنا ہو گا مگر یہ کام مشکل تھا

اور مالتی کے بس سے باہر تھا وہ اسی دنیا میں رہنا چاہتی تھی یہ اس کی مجبوری تھی

یا عادت یہ خود وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھی۔ لیکن امرناتھ کی وفا اور محبت کے آگے وہ جھک گئی۔ اور دوسرے دن امرناتھ جب کھدر کا نیا سوٹ پہن کر مالتی کے گھر پہنچے تو اس نے ایسا بناؤ سنگار کیا تھا کہ گویا آج بہت بڑا معرکہ سر کرنا ہے خطرہ کے اس فطری احتمال نے جو عورتوں کیلئے مخصوص ہے، مالتی کو زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ اب تک اس نے کبھی امرناتھ کی جانب خصوصیت کے ساتھ التفات نہ کیا تھا اس سے بے پروائی سے سلوک کرتی تھی۔ لیکن جب سے وہ دیوی جی کی بات سنی تھی اس کے دل میں یہ خیال بار بار آتا تھا کہ کہیں امرناتھ کا جھکاؤ اس دیوی جی کی طرف نہ ہو گیا ہو۔ اسی لئے وہ بناؤ سنگار سے آراستہ ہو کر اس نئے شکاری کو ہمیشہ کے لئے اپنے راستہ سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ لیکن مالتی کو کیا معلوم تھا کہ اس کا فیصلہ وقت کے ہاتھوں محفوظ ہے اور وقت ہی کھرے اور کھوٹے میں فرق کرنے والا ہے۔

مالتی امرناتھ کے گھر آ گئی اور پھر وہ دیوی بھی مقررہ وقت پر پہنچ گئیں مالتی نے دیوی کو دیکھا معصوم دوشیزہ ہے۔ جسے کسی صورت حسین نہیں کہہ سکتے پر اس کی معصومیت اور سادگی میں جو کشش تھی اس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی دیوی جی نے بھی دیکھا۔ ایک تکلف پسند، بیباک، مغرور عورت ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اس گھر میں بیگانہ سی معلوم ہو رہی ہے امرناتھ سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑے تھے اور ایشور سے دعا کر رہے تھے کہ کسی طرح آج پردہ رہ جائے

دیوی جی نے آتے ہی کہا۔ بہن آپ اب بھی سر سے پاؤں تک بدیشی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔

مالتی نے امرناتھ کی طرف دیکھ کر کہا۔ میں بدیسی اور دیسی کے پھیرے میں نہیں پڑتی جو یہ لا کر دیتے ہیں وہ پہنتی ہوں، لانے والے ہیں۔ یہ میں تھوڑی ہی بازار جاتی ہوں"

دیوی نے امرناتھ کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا اور کہا "آپ تو کہتے تھے یہ ان کی فرمائش ہے۔ یہ آپ ہی کا قصور نکل آیا۔"

مالتی:۔ تم میرے سامنے ان سے کچھ نہ کہو، تم بازار میں کبھی دوسرے مردوں سے باتیں کر سکتی ہو۔ جب وہ باہر چلے جائیں تو جتنا جی چاہے کوسنا میں اپنے کانوں سے یہ سب کچھ سننا نہیں چاہتی۔

دیوی جی۔ میں کچھ کہتی نہیں ہوں، بہن جی کہہ ہی کیا سکتی ہوں کوئی زبردستی تو ہے نہیں۔ صرف عرض کر سکتی ہوں۔

مالتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اپنے ملک کی بھلائی کا ذرا بھی خیال نہیں۔ اس کا ٹھیکہ تمہیں نے لے لیا ہے کھدر کی ساڑی پہن لی جھولی لٹکائی جہاں چاہیں جائیں جس سے چاہیں ہنسیں بولیں گھر میں کوئی پوچھتا نہیں تو جیل خانے کا بھی کیا ڈر اسے بڑھونگا پن سمجھتی ہوں جو شریفوں کی بہو بیٹیوں کیلئے جائز نہیں۔

امرناتھ دل میں کٹے جاتے تھے دیوی کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ تھا لیکن آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ امرناتھ نے مالتی سے ذرا تیز لہجہ میں کہا، "کیوں خواہ مخواہ کسی کا دل دکھاتی ہو، یہ دیویاں اپنا عیش و آرام چھوڑ کر یہ کام کر رہی ہیں کیا تمہیں اس کی بالکل خبر نہیں"

مالتی:۔ رہنے دو بہت تعریف نہ کرو، زمانہ کا رنگ ہی بدلا جا رہا ہے میں کیا کروں گی اور تم کیا کرو گے۔ تم مردوں نے عورتوں کو گھر میں اتنی بری طرح قید کیا کہ آج وہ رسم و رواج شرم و حیا کو چھوڑ کر نکل پڑی ہیں اور کچھ دنوں میں تم لوگوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ ولایتی اور بدیشی تو دکھانے کیلئے ہے اصل میں یہ آزادی کی خواہش ہے جو تمہیں حاصل ہے تم اگر بازار کی سیر کر سکتے ہو تو عورت کیوں نہ کرے۔ یہ ہے حقیقت اگر آنکھیں ہیں تو کھول کر دیکھو، مجھے

وہ آزادی نہ چاہیئے یہاں تو لاج دھوتے ہیں اور میں شرم و حیا کو اپنا سنگار سمجھتی ہوں

دیوی جی نے امرناتھ کی طرف دیکھا اور کہا۔ بہن نے عورتوں کو ذلیل کرنے کی قسم سی کھالی ہے۔ میں بڑی بڑی امیدیں لے کر آئی تھی مگر شاید یہاں سے ناکام جانا پڑیگا

امرناتھ نے وہ ساڑھی اسے دیتے ہوئے کہا نہیں بالکل ناکام تو آپ نہ جائیں گی۔ ہاں متوقع کامیابی نہ ہوگی۔ مالتی نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ وہ میری ساڑھی ہے اسے تم نہیں دے سکتے"

امرناتھ نے خفت آمیز لہجہ میں کہا۔ اچھی بات ہے نہ دونگا دیوی جی ایسی حالت میں شائد آپ مجھے معاف کریں گی۔

دیوی جی چلی گئیں تو امرناتھ نے تیوریاں بدل کر کہا۔ یہ تم نے آج میرے منہ میں کالکھ لگا دی۔ تم اتنی بدتمیز اور بدزبان ہو مجھے معلوم نہ تھا"

مالتی نے تند لہجہ میں کہا تو اپنی ساڑھی اسے دے دیتے۔ اب تو بدتمیز بھی ہوں بدزبان بھی ہوں۔ اس دن ان برائیوں میں سے ایک بھی نہ تھی۔ کہ جب میری جوتیاں سیدھی کرتے تھے اس چھوکری نے موہنی ڈال دی جیسی روح دیسے فرشتے دیا لمرک ہو یہ کہکر مالتی باہر نکلی اس نے سمجھا تھا چرب زبانی اور حسن کی طاقت سے وہ اس دوشیزہ کو شکست دے گی لیکن جب معلوم ہوا کہ امرناتھ آسانی سے قابو میں آنیوالا نہیں ہے تو اسنے پھٹکار بتائی

امرناتھ مالتی کے ساتھ دروازے تک آئے جب وہ تانگہ پر بیٹھی تو امرناتھ نے منت کرتے ہوئے بولے یہ ساڑھی دیدو نا مالتی میں کل تمہیں اس سے زیادہ قیمتی ساڑھی لادوں گا"

مالتی نے بے اعتنائی سے کہا۔ یہ ساڑھی تو اب لاکھ روپے پر بھی نہیں دے سکتی۔

امرناتھ نے تیوریاں بدل کر کہا۔ اچھی بات ہے لے جاؤ۔ مگر سمجھ لو کہ یہ میرا آخری تحفہ ہے"

قاتل

دھرم ویر ایک شکیل و توانا نوجوان تھا۔ اس کی بوڑھی بیوہ ماں اچھی جاڑوں کی رات تھی چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گلیوں میں سناٹا تھا۔ بوڑھی بیوہ ماں نے اپنے نوجوان بیٹے دھرم ویر کے سامنے تھالی پرستے ہوئے کہا تم رات تک کہاں رہتے ہو بیٹا؟ رکھے رکھے کھانا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

دھرم ویر تھالی کھینچتے ہوئے بولا "ابھی تو دس بھی نہیں بجے اماں یہاں کے کے مردہ دل آدمی سرِ شام ہی سو جائیں تو کوئی کیا کرے۔ یورپ میں لوگ بارہ ایک بجے تک سیر و تفریح کرتے رہتے ہیں ہم لوگ بہت سونے کے عادی ہیں یہ بالکل غلط ہے کہ آدمی کو آٹھ گھنٹے سونا چاہیئے انسان جتنا کم سوئے اتنا ہی اچھا ہماری سبھا نے اپنے دستور العمل میں داخل کر لیا ہے کہ اس کے ممبروں کو تین گھنٹے سے زیادہ نہ سونا چاہیئے۔ ماں اس سبھا کا ذکر سنتے سنتے تنگ آ گئی تھی یہ نہ کھاؤ وہ نہ کھاؤ، یہ نہ پہنو وہ نہ پہنو، نہ بیاہ کرو نہ نوکری کرو۔ یہ سبھا کیا آدمیوں کو سنیاسی بنا کر چھوڑے گی۔ آخر سبھا والے کوئی کام بھی کرتے ہیں، یا محض آدمیوں پہ قیدیں ہی لگایا کرتے ہیں؟"

دھرم ویر بولا "جو کام تم کرتی ہو، وہی ہم کرتے ہیں، تمہارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے ہمارا مقصد بھی قوم کی خدمت ہے۔

بوڑھی بیوہ جنگ آزادی میں دل و جان سے شریک تھی۔ دس سال قبل اس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزایاب ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت خراب ہو گئی اور جیل ہی میں وہ مر گیا۔ تب سے یہ بیوہ خلوص و انہماک

سے قوم کی خدمت میں مصروف تھی۔

ماں نے دھرم ویر سے پوچھا۔ تمہاری سبھا کا کوئی دفتر ہے؟

دھرم ویر نے جواب دیا ”ہاں ہے! ابھی تو صرف پچیس ممبر ہیں لیکن وہ پچیس آدمی جو کچھ کر سکتے ہیں وہ تمہارے پچیس ہزار بھی نہیں کر سکتے۔ دیکھو ماں کسی سے کہنا مت، ورنہ سب سے پہلے میری جان پر آفت آئے گی مجھے امید نہیں کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے۔ یہ تو اپنی کمزوری اور معذوری کا اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں نہیں آزاد ہوا کرتیں۔ مجھے یہ طرز عمل بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کے رونے دھونے اور مچلنے پر کھلونے اور مٹھائیاں ملا کرتی ہیں۔ وہی ان کو مل جائے گا اصلی چیز جب ہی ملے گی جب ہم اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں گے۔“

ماں نے کہا۔ اس کی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں؟ ہمارے لاکھوں آدمی جیل نہیں گئے؟ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے ہم نے اپنی جائدادیں نہیں ضبط کرائیں؟“

دھرم ویر:۔ اس سے انگریزوں کا کیا نقصان ہوا؟ وہ ہندوستان اس وقت چھوڑیں گے جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ اب وہ ایک لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے اگر آج ہندوستان کے ایک ہزار انگریز قتل کر دیئے جائیں تو آج ہی سوراجیہ مل جائے روس اس طرح آزاد ہوا۔ آئرلینڈ بھی اسی طرح آزاد ہوا اور ہندوستان بھی اسی طرح آزاد ہوگا اور کوئی طریقہ نہیں ہمیں انکا خاتمہ کر دینا ہے۔“

ماں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی اس نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھکر کہا بیٹا تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ انگریزوں کو قتل کر دینے سے ہم آزاد ہو جائیں گے؟ ہم انگریزوں کے دشمن نہیں ہم اس طرز حکومت کے دشمن ہیں۔ ہم اس غیر آئینی حکومت کو بدلنا چاہتے ہیں۔ میں تمہارے پیر پڑتی ہوں

اس سبھا سے اپنا نام کٹوا لو میں اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ نہیں دیکھنا چاہتی کہ تم عدالت میں خون کے جرم میں لائے جاؤ

دھرم ویر پر اس منت آمیز التجا کا کوئی اثر نہ ہوا، کہنے لگا، اماں تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں، تم اپنے دھرنے دیئے جاؤ جلوس نکالے جاؤ، ہم جو کچھ کرتے ہیں ہمیں کرنے دو۔ گناہ اور ثواب، پاپ اور پُن دھرم اور ادھرم یہ بے معنی الفاظ ہیں جس کام کو تم گناہ سمجھتی ہو، اسے میں عین ثواب سمجھتا ہوں کرشن بھگوان نے صاف کہا کہ مارنے والا میں ہوں اور زندہ کرنے والا میں ہوں، یہ آدمی کا کام نہیں ہے پھر کہاں رہا گناہ، یہ انفرادی جنگ نہیں۔ انگلینڈ کی مجموعی طاقت سے جنگ ہے۔ میں مروں یا میرے عوض کوئی دوسرا مرے۔ اس میں کوئی فرق نہیں جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کر سکتا ہے، اسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے۔

ماں حیرت سے لڑکے کا منہ دیکھنے لگی۔ اس سے مباحثہ کرنا بے سود تھا اپنی دلیلوں سے وہ اسے قائل نہ کر سکتی تھی دھرم ویر کھانا کھا کر اٹھ گیا مگر وہ مفلوج سی بیٹھی رہی اس نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی کو قتل کر آیا ہو، یا قتل کرنے جا رہا ہو اس خیال سے اس کے جسم میں رعشہ آ گیا۔ دھرم ویر باہر کمرے میں سویا کرتا تھا۔ اسے گمان ہوا وہ کہیں چلا نہ گیا ہو فوراً اس کے کمرے میں آئی دھرم ویر کے سامنے چراغ دان پر چراغ جل رہا تھا۔ وہ ایک کتاب پڑھتے ہوئے سو گیا تھا۔ کتاب اس کے سینے پر پڑی تھی ماں نے وہیں بیٹھ کر اس کے لئے دعا کی۔ اس کے دلی جذبات کا اندازہ کرنے لگی کہ اس کے بیٹے میں خدمت کا کتنا جذبہ ہے۔ جو شخص جان جیسی چیز کو قربان کرنے کیلئے آمادہ ہو اس کی تڑپ کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ کاش! یہ جوش، یہ درد اہنسا کے پنجہ سے نکل سکتا تو بیداری کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی‘‘

ماں کی آہٹ پاکر دھرم دیر چونک پڑا اور کتاب سنبھالتا ہوا بولا۔ تم کب آگئیں اماں؟ مجھے تو نہ جانے کب نیند آگئی۔ ماں نے جواب دیا۔ تمہاری باتوں نے ڈرا دیا تو مجھے کیوں اپنی سبھا میں نہیں شریک کرلیا۔ دھرم دیر نے کوئی جواب دیا ماں نے متانت سے کہا۔ نہیں بیٹیا! مذاق نہیں کر رہی ہوں دل سے کہہ رہی ہوں، ماں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے تمہیں اتنے بڑے خطرے میں تنہا چھوڑ کر میں گھر میں نہیں بیٹھ سکتی اور اگر کوئی ایسا موقع آیا تو تم سے پہلے میں قربان ہو جاؤں گی۔ یہ مت سمجھو کہ میں نازک موقعوں پہ ڈر جاؤں گی۔

دھرم دیر نے عقیدت سے سرشار ہوکر ماں کے قدموں کا بوسہ لیا اور دوسرے ہی دن آزمائش کا موقع درپیش ہوا۔ یہ دو دن بڑھیا نے ریوالور کی مشق میں صرف کئے، پٹاخے کی آواز پر کانوں پر ہاتھ رکھنے والی اپنا اور دھرم کی دیوی اتنی دلیری سے ریوالور چلاتی تھی۔ اس کا نشانہ بے خطا ہوتا تھا کہ سبھا کے نوجوانوں کو بھی حیرت ہوتی تھی۔

پولیس کے افسر اعلیٰ کے نام موت کا حکم سبھا نے دیا اور یہ خدمت دھرم ویر کے سپرد ہوئی جب دونوں گھر پہنچے تو ماں نے پوچھا کیوں بیٹا اس افسر نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی پھر سبھا نے کیوں اسکا انتخاب کیا؟

دھرم ویر ماں کی سادگی پہ مسکرا کر بولا۔ تم سمجھتی ہو کہ ہمارے کانسٹیبل اور سب انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ جو کچھ کرتے ہیں اپنی خوشی سے کرتے ہیں؟ وہ لوگ جتنے مظالم کرتے ہیں ان سب کے لئے یہی شخص ذمہ دار ہے۔

ماں خاموش ہوگئی اور دھرم دیر نے پھر اپنی ماں سے کہا اگر تمہیں خوف ہو تو میرے ساتھ نہ چلو۔ میں کوئی بہانہ کروں گا اور کسی دوسرے کا مرید کو ساتھ

لے لوں گا۔ اگر تمہارے دل میں ضعف ہو تو مجھے فوراً بتلا دو۔"

رات اندھیری تھی اور دھرم دیر کو اسی رات پولیس کے افسر اعلیٰ کو قتل کرنا تھا۔ وہ اس خاص مقام کا انتخاب کر لیا۔ جہاں سے وہ نشانہ مارے گا صاحب کے بنگلہ سے قریب کریل اور کروندے کی ایک چھوٹی سی جھاڑی تھی وہیں پر اس کا مکان تھا۔ ماں اور بیٹے دونوں جھاڑی میں پہنچکر چپ چاپ بیٹھ گئے کوئی آدھ گھنٹے کے بعد صاحب کی موٹر نکلی دھرم دیر نے غور سے دیکھا موٹر کی رفتار سست تھی صاحب اور لیڈی دونوں بیٹھے ہوئے تھے نشانہ غیر متوقع تھا دھرم دیر نے جیب سے ریوالور نکالا۔

ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور موٹر آگے نکل گئی دھرم دیر نے کہا یہ تم نے کیا کیا اماں۔ ایسا سنہری موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔

ماں نے کہا۔ موٹر میں میم بھی تھی۔ کہیں میم ہی کو گولی لگ جاتی تو!" تو کیا مضائقہ تھا۔ ہمارے مذہب میں ناگ اور ناگن اور سنپولے میں کوئی فرق نہیں

ماں نے نفرت آمیز لہجہ میں کہا، تو تمہارا مذہب درندوں اور وحشیوں کا ہے، جو جنگ کے بنیادی اصولوں کی بھی پرواہ نہیں کرتا عورت ہر ایک مذہب میں معصوم سمجھی گئی ہے یہاں تک کہ وحشی بھی اسکا احترام کرتے ہیں۔"

میں اس معاملہ میں تمہاری پابندیوں کا غلام نہیں ہو سکتا بیٹے نے ماں کو جواب دیا

ماں نے کچھ جواب نہ دیا لیکن اس نامردانہ گفتگو سے اسکی ماممتا رنجیدہ ہو گئی تھوڑی دیر کے بعد وہی موٹر دوسری جانب سے آتی دکھائی دی دھرم دیر نے موٹر کو غور سے دیکھا اور اچھل کر بولا۔" اماں اب کی بار صاحب اکیلا ہی ہے۔ تم بھی میرے ساتھ نشانہ لگانا ماں نے لپک کر دھرم دیر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھیننے لگی۔ دھرم دیر نے اس کو ایک دھکا دیکر گرا دیا، اسی وقت گولی چلی

موٹر آگے نکل گئی۔ مگر ماں زمین پر پڑی تڑپ رہی تھی دھرم دیر تیزی سے ماں کے قریب گیا اور اسکو علم ہوا کہ وہ اپنی پیاری ماں کا قاتل ہے دھرم دیر کے منہ سے الفاظ نکل پڑے۔

آہ! اس بد نصیب کے ہاتھوں تمہاری موت لکھی تھی۔ جس کو تم نے گود میں پالا وہی تمہارا قاتل ہوا۔ اندھیرے میں کچھ بھی تو دکھائی نہیں دیتا"

ماں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ میری یہ دعا ہے، پرماتما تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ میں اور کیا کر سکتی ہوں بیٹا۔ ماں کی آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے میں تو چلی

ادیب کی عزّت

صبح کا وقت تھا، حضرت قمر نے قلم دوات سنبھالا اور وہ کتاب لکھنے میں محو ہوگئے۔ جو ان کے خیال میں اس صدی کی بہترین تصنیف ہوگی اور جس کی اشاعت پر وہ شہرت اور ناموری کے آسمان پر پہنچ جائیں گے۔

آدھ گھنٹے کے بعد بیوی آنکھیں ملتے ہوئے آکر بولی۔ چائے پی چکے قمر نے خوش ہوکر جواب دیا۔ ہاں پی چکا۔ بہت اچھی بنی تھی۔ آجکل سادہ چائے اچھی معلوم ہوتی ہے دودھ اور چینی ملانے سے چائے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ یورپ میں تو دودھ کا بالکل رواج نہیں ہے اور آج بیس سال سے وہ بغیر دودھ اور چینی کی چائے پیتے تھے اس بے نیازی کی شان سے جو ادیبوں کی امتیازی صفت ہے۔ انہوں نے کسب معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی اس بیماری میں جسم گھل گیا۔ صحت برباد ہوگئی اور چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے آکر گھیرا۔ طلوع آفتاب سے آدھی رات تک یہ ادب کا

بچاری دنیا و مافیہا سے بے خبر فکرِ سخن میں غرق رہتا تھا۔ لیکن آج تک کسی اخبار و رسالہ کے ایڈیٹر نے ان کو دل کھول کر داد نہ دی۔ جیسے ساری دنیا نے ان کے خلاف سازش کرلی ہو لیکن وہ برابر لکھنے میں مصروف رہتے اور دنیا کی ناقدری کی پرواہ کیے بغیر ہمیشہ تحریر میں مصروف رہتے۔ معاشی بدحالی کی ان کو پرواہ نہ تھی اور بیوی بھی ان کو قسمت سے ایسی مل گئی تھی کہ زبان پر کبھی بھی حرفِ شکایت نہ لاتی بلکہ ہمیشہ ان کی دلجوئی کرتی رہتی۔ اپنے نصیبوں کا رونا تو دور کی بات تھی اس دیوی نے کبھی ماتھے پر بل بھی نہ آنے دیا۔ سکینہ (قمر کی بیوی) نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے بولی ,, گھنٹہ آدھ گھنٹہ کہیں گھوم پھر کیوں نہیں آتے جب معلوم ہو گیا کہ جان دے کر کام کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں تو بے کار کیوں سر کھپاتے ہو۔

قمر نے بغیر قلم اٹھائے ہوئے کہا۔ لکھنے میں کم از کم یہ تسلی تو ہوتی ہے کہ کچھ کر رہا ہوں سیر کرنے میں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو رہا ہے اور سیر وہی لوگ کرتے ہیں جو مالی اور معاشی حیثیت سے اچھے ہوں اور جن کو ماہوار تنخواہ مل جاتی ہے۔ میں تو ملک کا مزدور ہوں تم نے کبھی مزدوروں کو ہوا کھاتے دیکھا ہے۔ جنہیں کھانے کی کمی ہو انہیں ہوا کی بھی ضرورت نہیں۔

سکینہ نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سن کر آنکھوں میں آنسو بھری اور اندر چلی گئی لیکن اس کا دل کہتا تھا کہ دولت حاصل ہو یا نہ ہو لیکن اس محنت کا پھل ایک دن انہیں ضرور ملے گا۔

اور پھر چند روز کے بعد ایک رئیس کے یہاں کوئی تقریب تھی اس نے حضرت قمر کو بھی مدعو کیا تھا۔ آج ان کا دل خوشی اور مسرت سے معمور تھا۔ سارا دن وہ اسی تخیل میں محو رہے کہ راجہ صاحب کن الفاظ میں ان کا خیر مقدم کریں گے اور وہ کن الفاظ میں ان کا جواب دیں گے۔ کن مضامین پر گفتگو ہو گی اور کن اصحاب

سے ان کا تعارف کرایا جائے گا۔ اس موقع کے لئے انھوں نے ایک نظم بھی لکھ لی تھی جس میں انھوں نے زندگی کو ایک بلغ سے تشبیہ دی تھی اور اس نظم میں کوئی ایسی بات نہ کہی گئی تھی جس سے رئیسوں اور امیروں کے جذبات کو ٹھیس لگے دوپہر ہی سے انھوں نے تیاریاں شروع کیں۔ حجامت بنوائی صابون سے نہائے سر میں تیل ڈالا۔ کپڑوں کی دقت تھی مدت ہوئی انھوں نے ایک اچکن سلوائی تھی لیکن یہ اچکن بھی بوسیدہ ہو چکی تھی لیکن اسی کو جھاڑ اور جھٹک کر نکال لیا۔

سکینہ نے کہا۔ تم نے ناحق وہاں جانا منظور کیا ان پھٹے حالوں جاتا تو بڑا ہے

قمر نے فلسفیوں کی سی سنجیدگی سے کہا۔ جنھیں خدا نے دل اور سمجھ دی ہے وہ آدمیوں کا لباس نہیں دیکھتے ان کے ہنر دیکھتے ہیں۔ آخر کچھ بات تو ہے کہ راجہ صاحب نے مجھے مدعو کیا ہے میں کوئی عہدیدار نہیں، زمیندار نہیں، ٹھیکہ دار نہیں معمولی ایک شاعر ہوں۔ شاعر کی قیمت اس کی نظمیں ہوتی ہیں"۔

سکینہ ان کی سادگی پر ترس کھا کر بولی تم خیالات کی دنیا میں رہتے رہتے حقیقی دنیا سے بالکل بیگانہ ہو گئے ہو میں کہتی ہوں راجہ صاحب کے یہاں لوگوں کی نگاہ سب سے زیادہ کپڑوں ہی پر پڑے گی۔ سادگی ضرور اچھی چیز ہے اس کے معنی یہ تو نہیں کہ بے وقوف ہی بن جائے۔

قمر نے جواب دیا میرا خیال ہے۔ چراغ جل جانے کے بعد جاؤں گا"۔

"میں تو کہتی ہوں جاؤ ہی کیوں؟ سکینہ بولی۔

قمر نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ اب تم کو کیسے سمجھاؤں ہر ایک شخص کے دل میں اعزاز و احترام کی بھوک ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ہماری روح کے ارتقاء کی ایک منزل ہے۔ اور میں بھی اس لئے لکھنے کا کام کئے جاتا ہوں ساری دنیا میٹھی نیند سوتی ہے اور میں قلم لئے بیٹھا ہوں لوگ سیر و تفریح کرتے ہیں اور میرے

لئے سب کچھ حرام ہے۔ اگر دنیا قدر نہیں کرتی تو کرے اس میں دنیا ہی کا نقصان ہے میرا تو کوئی نقصان نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے اسے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ میری خوشی کیلئے اتنا قدر کافی ہے کہ آج مجھے ایک رئیس نے بلایا ہے"

شام کے وقت حضرت قمر اپنی کھٹی پرانی اچکن اور پھٹے پرانے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے تو گنوار اچکے سے معلوم ہوتے تھے جب وہ راجہ صاحب کے بنگلے کے سامنے پہنچے تو دیئے جل چکے تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی موٹریں کھڑی تھیں دروازے پر وردی پوش دربان کھڑے تھے ایک صاحب مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ قمر کو دیکھکر وہ ذرا جھجکے پھر انہیں سر سے پاؤں تک دیکھکر بولے آپ کے پاس کارڈ ہے قمر صاحب کی جیب میں کارڈ تھا مگر وہ اس مطالبہ پر ناراض سے ہو گئے اور کہنے لگے میرے پاس کوئی کارڈ نہیں اگر آپ دوسروں سے کارڈ مانگتے تو میں بھی دکھا دیتا ہوں ورنہ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں، آپ راجہ صاحب سے کہہ دیجئے گا۔ قمر آیا تھا۔ لوٹ گیا

نہیں نہیں جناب! اندر چلئے آپ سے تعارف نہ تھا۔ معاف فرمائیے آپ ہی جیسے اصحاب سے تو محفل کی رونق ہے، خدا نے آپ کو وہ کمال عطا فرمایا ہے کہ سبحان اللہ"

قمر اندر داخل ہوئے اور راجہ صاحب نے خیر مقدم کیا اور احباب سے ان کا تعارف کرانے لگے۔ آپ نے حضرت قمر کا نام تو سنا ہوگا، وہ آپ ہی ہیں کیا شیرینی ہے کیا جدت ہے کیا تخیل ہے۔ کیا روانی اور ندرت ہے واہ واہ! میرا دل تو آپ کی چیزیں پڑھ کر ناچنے لگتا ہے۔

ایک صاحب نے جو انگریزی سوٹ میں تھے قمر سے بولے، آپ بائرن

شیلے ٹینی سن۔ وغیرہ کی نظموں میں سے کسی کا ترجمہ کر دیں تو آپ اپنی زبان کی بڑی خدمت کریں گے

قمر نے جواب دیا۔ ہمارے یہاں روحانیت کا بھی اتنا فقدان نہیں ہوا کہ مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں۔ میرا خیال ہے کم از کم اس مضمون میں ہم اب بھی مغرب کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔

انگریزی پوشش صاحب نے قمر کو پاگل سمجھا راجہ صاحب نے بھی قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ ذرا موقع و محل دیکھکر باتیں کرو اور بولے۔ انگریزی ادب کا کیا کہنا۔ شاعری میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔"

انگریزی پوشش :۔ ہمارے شاعروں کو ابھی تک اتنا بھی معلوم نہیں کہ شاعری کے معنی کیا ہیں وہ ابھی تک ہجر و وصال کو شاعری کا منتہائے مقصود سمجھے بیٹھے ہیں۔

قمر نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ میرا خیال ہے، آپ نے ہندوستانی شعراء کا کلام ابھی تک دیکھا ہی نہیں۔ اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں ہے۔

راجہ صاحب نے اس بحث کو ختم کرنے کیلئے کہا آپ مسٹر پرانچپے ہیں آپ کے مضامین انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔"

پھر اس دعوت میں ڈاکٹر چڈھا تشریف لائے راجہ صاحب نے قمر کا تعارف بھی ان سے کرایا اور ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز سے کہا اچھا آپ شاعر ہیں۔ اور بغیر کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئے یہ تماشا کئی مرتبہ ہوا اور ہر بار قمر کو یہی داد ملی۔ اچھا آپ شاعر ہیں۔

یہ الفاظ ہر مرتبہ قمر کے دل پر ایک نیا صدمہ پہنچاتے کیونکہ انکا عام فہم الفاظ میں یہ مطلب تھا کہ تم اپنے خیالی پلاؤ پکاتے ہو یکاؤ یہاں تمہارا کیا کام قمر خود پر جھنجھلا رہے تھے۔ دعوتی کارڈ پاکر وہ پھولے نہ سماتے تھے۔

لیکن یہاں آکر جس قدر تذلیل ہوئی تھی۔ اس کو دیکھکر اپنا اطمینان اور سکون کا جھونپڑا جنت سے کم دکھائی نہ دیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو لعن طعن کی تمہارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے۔ اب تو آنکھیں کھلیں کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو تم خود اس غرض مند دنیا میں کسی کے کام نہیں آسکتے وکیل۔ بیرسٹر تمہارا احترام کیوں کریں تم ان کے موکل نہیں ہو سکتے، ڈاکٹر اور حکیم تمہاری طرف کیوں دیکھیں۔ انہیں بغیر فیس کے تمہارے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ تم لکھنے کے لئے بنے ہو۔ لکھتے جاؤ۔ لکھتے جاؤ۔ بس دنیا میں تمہارا اور کوئی مصرف نہیں ہے"

یکایک لوگوں میں ہلچل مچ گئی۔ آج کا جلسہ جن صاحب کے اعزاز میں تھا وہ آگئے یہ صاحب یورپ سے کوئی بڑی ڈگری لے کر آئے تھے۔ راجہ صاحب نے قمر سے فرمائش کی آپ اپنی نظم سنائیے قمر نے جواب دیا۔ میرے پاس کوئی نظم نہیں ہے

آپ نے غضب ہی کر ڈالا ابھی دو چار اشعار لکھ ڈالو، ایسے موقع پر ایک نظم کا پڑھا جانا لازمی ہے۔ راجہ صاحب نے کہا۔

میں اسقدر جلدی میں کوئی چیز نہیں لکھ سکتا اور نہ کسی پرانے یا قدیم شاعر کی نظم سنا سکتا ہوں یہ کام کوجاٹ اور میراثی کا ہے قمر نے جواب دیا۔

میں نے بیکار اتنے آدمیوں سے آپ کا تعارف کروایا۔

بالکل بیکار " یہ کہکر حضرت قمر اس محفل سے نکل گئے اور جب گھر پہنچے تو انکا چہرہ کھلا ہوا تھا سکینہ نے خوش ہو کر پوچھا اتنی جلدی کیونکر چلے آئے۔ خوب عزت افزائی ہوئی ہوگی خوب خوش ہو رہے ہو۔ اس کے جواب میں شاعر قمر نے جواب دیا۔ آج مجھے ہمیشہ کیلئے ایک سبق مل گیا میں چراغ ہوں اور جلنے کیلئے بنا ہوں میں یہ بات بھول گیا تھا میرا یہ جھونپڑا ہی میرے لئے ایک جنت ہے میں نے آج سمجھ لیا کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔"

دو بیل

جانوروں میں گدھا سب سے بیوقوف سمجھا جاتا ہے لیکن گدھے کا ایک بھائی اور بھی ہے، جو اس سے کچھ ہی کم گدھا ہے اور وہ ہے بیل۔ جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ ہے بے وقوف۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بیل کو بیوقوفوں کا سردار کہتے ہیں مگر ہمارا خیال ایسا نہیں ہے بیل کبھی کبھی مارتا ہے۔ کبھی کبھی اڑیل بیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں اور کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ گدھے سے نیچے ہے۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے۔ ایک کا نام ہیرا تھا دوسرے کا موتی۔ دیکھنے میں خوبصورت کام میں چوکس۔ ڈیل ڈول میں اونچے بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے تھے دونوں میں محبت سی ہوگئی تھی ایک مرتبہ جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لئے اپنے سسرال بھیجے۔ بیلوں کو کیا معلوم وہ کیوں بھیجے گئے ہیں۔ شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں جا پہنچے دن بھر کے بھوکے تھے۔ لیکن جب ناند میں لگائے گئے تو کسی نے بھی اس میں منہ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ جسے انھوں نے اپنا گھر سمجھا تھا وہ آج ان سے چھوٹ گیا تھا۔ یہ نیا گھر نیا گاؤں نئے آدمی سب انہیں بیگانے سے لگتے تھے دونوں نے چپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا اور لیٹ گئے اور جب آدھی رات ہوگئی تو دونوں بیلوں نے زور مار کر پگھے تڑائے اور گھر کی طرف چل دیئے۔ جھوری نے صبح اٹھکر

دیکھا کہ دونوں بیل چرنی پر کھڑے تھے دونوں کی گردنوں میں آدھا آدھا رسہ لٹک رہا تھا اور دونوں کی آنکھوں میں محبت اور ناراضگی جھلک رہی تھی۔ جھوری ان کو دیکھ کر محبت سے باولا ہو گیا۔ اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازے پر دیکھا تو جل اٹھی بولی یہ کیسے نمک حرام ہیں ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا اور بھاگ کھڑے ہوئے جھوری اپنے بیلوں پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا۔ بولا نمک حرام کیوں ہیں چارہ دانہ نہ دیا ہوگا۔ تو کیا کرتے۔

عورت نے تنگ آکر کہا۔ بس تمہیں بیلوں کو کھلانا جانتے ہو اور دوسرے پانی پلا پلا کر رکھتے ہیں۔ اب دیکھتی ہوں، کہاں سے کھلی اور چوکر آتا ہے خشک بھوسے کے سوائے کچھ نہ دونگی۔ کھائیں چاہیں مریں۔

وہی ہوا۔ مزدور کو کڑی تاکید کر دی گئی کہ بیلوں کو صرف خشک بھوسہ دیا جائے بیلوں نے ناند میں منہ ڈالا تو پھیکا پھیکا نہ چکنا ہٹ نہ رس، کیا کھائیں پر امید نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھنے لگے تاکہ ان کا مالک ان کے لئے کچھ سکے مگر جھوری بھی بیوی کی دباؤ میں تھا۔

دوسرے دن جھوری کا سالا پھر آیا اور بیلوں کو لے چلا شام کے وقت گھر پہنچا۔ گیا نے دونوں کو موٹی رسیوں سے باندھا اور کل کی شرارت کا مزہ چکھایا۔ پھر وہی خشک بھوسہ ڈالدیا۔ ہیرا اور موتی اس برتاؤ کے عادی نہ تھے۔ جھوری انہیں پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارتا تھا۔ اس کی آواز پر دونوں اڑنے لگتے تھے۔ یہاں پر مار پڑی اس پر خشک بھوسہ ناند کی طرف یہ آنکھ بھی نہ اٹھائی۔

دوسرے دن گیا نے بیلوں کو ہل میں جوتا، پر ان دونوں نے جیسے پاؤں اٹھانے کی قسم کھائی تھی۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا مگر انھوں نے پاؤں نہ اٹھایا گلے میں موٹی موٹی رسیاں نہ ہوتیں تو وہ دونوں نکل گئے ہوتے شام ہوئی اور گیا نے دونوں بیلوں کو گھرے آیا اور پھر وہی خشک بھوسہ ڈالا گیا دونوں نے چپ چاپ کھڑے رہے گھر کے لوگ کھانا کھانے لگے اسی وقت چھوٹی سی دو لڑکیاں دو روٹیاں لئے نکلی اور دونوں کے منہ میں دے کر چلی گئی۔ اس ایک ایک روٹی سے ان کی بھوک تو کیا مٹتی مگر دونوں کے دل کو کھانا مل گیا۔ معلوم ہوا یہاں بھی کوئی صاحب دل ہے۔ لڑکی گیا کی تھی اس کی ماں مرگئی تھی سوتیلی ماں اسے مارتی رہتی تھی۔ اس لئے ان بیلوں سے اسے ہمدردی ہوگئی تھی۔ دونوں بیل دن بھر جوتے جاتے اور رات کو وہی لڑکی انہیں ایک ایک روٹی دے جاتی۔ محبت کے اس کھانے کی یہ برکت تھی کہ دو چار خشک بھوسے کے لقمے کھا کر بھی دونوں کمزور نہ ہوتے تھے۔ مگر دونوں کی آنکھوں میں سرکشی بھری تھی۔ ایک دن چپ کی زبان میں موتی نے کہا اب تو سہا نہیں جاتا ہیرا

ہیرا نے کہا۔ تو پھر کیا کرنا چاہیئے

موتی۔ گیا کو سینگ پر اٹھا کر پھینک دوں گا؟

ہیرا۔ مگر وہ لڑکی اسی کی بیٹی ہے۔ اسے مار کر گراؤ گے تو وہ یتیم ہو جائیگی

موتی۔ تو مالکن کو پھینک دوں وہ لڑکی کو ہر روز مارتی ہے

ہیرا۔ عورت کو مارو گے بڑے بہادر ہو۔

آخر کار دونوں بیلوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ رات میں موٹی رسی چبا ڈالیں گے اور پھر جھٹکا دے کر رسی تڑا لینگے۔ رات کو جب لڑکی روٹیاں دیکر چلی گئی

تو دونوں رسیاں چبانے لگے۔ پر موٹی رسی منہ میں نہ آتی تھی۔ بیچارے بار بار زور لگا کر رہ جاتے اتفاقاً گھر کا دروازہ کھلا اور وہی لڑکی نکلی دونوں بیل سر جھکا کر اس کا ہاتھ چاٹنے لگے۔ لڑکی نے ان کی پیشانی سہلائی اور بولی کھول دیتی ہوں بھاگ جاؤ نہیں تو یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے آج گھر میں مشہور ہو رہا ہے کہ تمہاری ناک میں نتھ ڈال دی جائیگی۔ اور لڑکی نے دونوں کے رسے کھول دیئے لیکن دونوں چپ چاپ کھڑے رہے اور پھر ہیرا نے موتی سے کہا۔ اس غریب لڑکی پر آفت آ جائیگی۔ سب اسی پر شبہ کریں گے۔ یکایک لڑکی چلائی او دادا او دادا دونوں بیل بھاگے جا رہے ہیں۔ دوڑو دونوں بیل بھاگے جا رہے ہیں۔

گیا گھبرا کر باہر نکلا اور بیلوں کو پکڑنے چلا۔ بیل بھاگے۔ گیا نے پیچھا کیا وہ بھی تیز ہو گئے اور گیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ لیکن بھاگتے میں دونوں بیل اپنا راستہ بھول گئے اور ایک دوسرے کھیت میں پہنچ گئے یہ ایک مٹر کا کھیت تھا۔ دونوں اس کھیت میں گھس گئے ابھی دو ہی چار منہ مارے تھے کہ دو آدمی لاٹھیاں لئے آ گئے اور دونوں بیلوں کو گھیر لیا دوسرے دن دونوں بیل کانجی ہاؤس میں تھے۔ بیلوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سارا دن گذر گیا اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ ملا۔ اس سے تو گیا ہی اچھا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا یہ کیسا مالک ہے یہاں پر کئی بھینسیں تھیں کئی بکریاں، کئی گھوڑے، کئی گدھے مگر چارہ کسی کے سامنے بھی نہ تھا۔ سب زمین پر مردے کی طرح پڑے تھے۔ کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔

سارا دن دوست دروازہ کی طرف دیکھتے رہے مگر کوئی چارہ لیکر نہ آیا۔ تب انھوں نے دیوار کی نمکین مٹی چاٹنا شروع کی مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی رات کو جب کھانا نہ ملا تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے

موتی سے بولا مجھے تو معلوم ہوتا ہے جان نکل رہی ہے۔ موتی نے کہا۔ اتنی جلدی ہمت نہ ہار و بھائی! یہاں سے بھاگنے کا کوئی طریقہ سوچو"

آخر کار دونوں بیلوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کانجی ہاؤس کی دیوار گرا دینگے اور پھر رات میں انھوں نے اپنے سینگوں سے دیوار کا آدھا حصہ گرا دیا اور دوسرے جانوروں کو رہا کر دیا۔ اور وہ بھاگ نکلے لیکن گدھے ابھی تک کھڑے تھے ہیرا نے پوچھا "تم کیوں نہیں جاتے؟ انھوں نے کہا۔ کہیں پھر پکڑ لئے جائیں تو"

ہیرا۔ پکڑ لئے جائیں تو پھر دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو موقع ہے۔

گدھا۔ ہمیں ڈر لگتا ہے۔ ہم نہ بھاگیں گے۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ دونوں گدھے کھڑے سوچ رہے تھے۔ بھاگیں یا نہ بھاگیں۔ موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا۔ جب وہ ہار گیا تو ہیرا نے کہا "تم جاؤ مجھے یہیں رہنے دو شاید کبھی ملاقات ہو جائے، ہیرا کی گردن میں ایک موٹی رسی اس کے سرکشی کرنے کے الزام میں ڈالدی گئی تھی کیونکہ اسی نے سب سے پہلے اپنی سینگوں سے دیوار گرانے کی کوشش کی تھی اور کانجی ہوس کا چوکیدار اس کو اس کے جرم کی پاداش میں موٹی رسی سے باندھ دیا تھا

موتی نے ہیرا سے جب یہ بات سنی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہا۔ تم مجھے اتنا خود غرض سمجھتے ہو، ہیرا۔ ہم اور تم دونوں ساتھ رہے آج تم مصیبت میں پھنسے تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں"

یہ کہکر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار کر باہر نکال دیا اور خود اپنے دوست کے پاس آکر سو گیا۔

اور جب صبح ہوئی تو چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی اور اسے بھی موٹی رسی سے باندھ دیا گیا۔

لیکن دونوں بیل اس بات پر خوش تھے کہ ان کی کوششوں سے دوسرے مظلوم نو دس جانوروں کی جان بچ گئی۔

ایک ہفتے تک دونوں بیل بندھے پڑے رہے۔ کسی نے چارہ کا ایک تنکا تک نہ ڈالا۔ البتہ ایک مرتبہ پانی دکھایا جاتا۔ یہی ان کی خوراک تھی دونوں اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ ہڈیاں نکل آئیں۔

ایک دن باڑے کے سامنے پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو گئے لیکن ان کمزور اور دبلے بیلوں کو کون خریدتا۔ لیکن ایک آدمی جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جس کے چہرے پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی شکل دیکھکر کسی نامعلوم احساس سے دونوں بیل کانپ اُٹھے۔ وہ کون ہے اور انہیں کیوں خریدتا ہے اس کے متعلق انہیں کوئی شبہ نہ رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا

نیلام ہو جانے کے بعد دونوں بیل اس آدمی کے ساتھ چلے دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بیچارے پاؤں تک نہ اٹھا سکتے تھے۔ مگر ڈر کے مارے چلے جاتے تھے۔ ذرا کوئی آہستہ چلتے تو وہ ڈنڈا جما دیتا تھا۔ معاً انہیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ راستہ دیکھا ہوا ہے۔ وہی کھیت ہیں۔ وہی باغ ہیں۔ وہی گاؤں اب انکی رفتار تیز ہونے لگی۔ دونوں مست ہو کر اپنے گھر کے راستے کی طرف دوڑے اور گھر پہنچ کر اپنے تھان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑ آتا تھا۔

جھوری دروازہ پر بیٹھا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک جھوری کا ہاتھ چاٹ رہا تھا دوسرا اس کا پیر۔

اس آدمی نے آکر بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں اور جھوری سے کہنے لگا یہ بیل میرے ہیں

اور میں نے ان کو نیلام میں لیا ہے۔"

جھوری کہنے لگا۔ چپکے سے چلے جاؤ، میرے بیل ہیں، میں بیچوں گا تو بکیں گے کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق ہے۔" اس پر وہ آدمی زبردستی بیلوں کو لیجانے کیلئے آگے بڑھا۔ اسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا موتی نے اس کا تعاقب کیا اور یہاں تک کیا کہ اس کو بہت دور بھگا دیا۔

اور جب موتی واپس آیا تو دونوں بیلوں کو کھلی۔ بھوسہ، چوکر اور دانہ خوب دیا گیا۔ دونوں بیل کھانے لگے۔ جھوری کھڑا ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مالکن نے آکر اپنے دونوں بیلوں کے ماتھے چوم لئے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سارا گاؤں مسکرا رہا ہے۔

جیب

آنند اور وشو میھر دونوں یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور دونوں دوست تھے۔ آنند دولت مند تھا اور شو میھر غریب پروفیسروں نے مہربانی کرکے ایک چھوٹا سا وظیفہ دے دیا تھا۔ روپ متی بھی ان ہی کی ہم جماعت تھی مگر اس سال اس کی صحت کچھ خراب ہوگئی تھی۔ اس لئے اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ دونوں کبھی کبھی اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ آنند اس کا دل لینے کیلئے آتا تھا اور وشو میھر یونہی دل بہلانے کیلئے کبھی کبھی آجاتا تھا۔

آج آنند روپ متی کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا۔ وشو میھر نے کیسی حماقت کی ہے۔ امتحان قریب ہے اور آپ آج وہ انٹیرین بیٹھے کہیں پکڑے گئے تو امتحان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے میرا تو خیال ہے وظیفہ بھی بند ہو جائیگا۔

روپ متی بولی یہ تو بہت برا ہوا۔ تم نے سمجھایا نہیں۔ آنند نے منہ بنا کر کہا جب

کوئی اپنے کو دوسرا گاندھی سمجھ لے تو اسے سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ الٹا مجھے سمجھانے لگتا ہے۔ اور پھر آنند نے وشنو میھر کا وہ خط روپ متی کے حوالے کیا جو آنند کے نام تھا۔ روپ متی کا چہرہ خط پڑھتے پڑھتے چمکنے لگا۔ گردن تن گئی اور آنکھوں میں ایثار کی سرخی آ گئی۔ وشنو میھر کے خط کے الفاظ یہ تھے کہ یونیورسٹی کی ڈگری اچھی شئے ہے لیکن خدمت وطن کا تمغہ اس سے کہیں اچھا ہے یہ میری عزت کا سوال ہے اور عزت کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر سکتی۔

روپ متی نے خط کو میز پر رکھ دیا اور تھوڑی دیر پہلے وہ ارادہ کر چکی تھی کہ وہ وشنو میھر کو سمجھانے جائے گی لیکن اس کے یقین محکم کے آگے وہ سرنگوں ہو گئی اور آنند سے کہنے لگی نہیں اب میرا جانا بھی بیکار ہے۔ آنند نے کہا۔ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اس وقت اس کے سر پر بھوت سا سوار ہے اس پر کسی کے سمجھانے کا اثر نہ ہوگا۔ جب سال بھر جیل میں چکی پیس لے گا۔ اور وہاں سے تپ دق لیکر نکلے گا یا پولیس کے ڈنڈے سے سر اور ہاتھ پاؤں تڑوا لیگا تو عقل ٹھکانے آئے گی۔ ابھی تو جیئے جے اور تالیوں کے خواب دیکھ رہا ہوگا۔

روپ متی سامنے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اسے نیلے آسمان میں بادل کی ایک تصویر سی نظر آئی کمزور دبلی پتلی، برہنہ جسم، گھٹنوں تک دھوتی چکنا سر، پوپلا منہ، عبادت، ایثار اور صداقت کی زندہ مورت۔

آنند نے پھر کہا۔ اگر مجھے یقین ہو کہ میرے خون سے ملک بیدار ہو جائیگا۔ تو میں اپنا خون دینے کو آج تیار ہوں۔ لیکن میرے جیسے سو پچاس آدمی نکل گئے تو کیا ہوگا۔ جان دے دینے کے علاوہ اور تو کچھ نتیجہ نظر نہیں آتا۔ جن کو امتحان کا بھوت ستایا کرتا ہے انہیں خدمت وطن کی سوجھتی ہے۔

روپ متی کی آنکھیں اب بھی وہی بادل کی تصویر دیکھ رہی تھیں اس کا وہ تبسم

وہ سادہ و دلفریب مسکراہٹ جس نے کائنات کو جیت لیا ہے۔ وہ خاموش تھی بالکل خاموش۔ تھوڑی دیر کے بعد آنند نے اس کو سیتا پور چلنے کیلئے کہا لیکن روپ متی نے اس کو ٹال دیا۔

آنند چلے جانے کے بعد روپ متی سوراج بھون پہنچی تو والنٹیروں کی ایک جماعت بدیشی کپڑوں کے گوداموں پر دھرنا دینے جا رہی تھی۔ وشومبھر اس جماعت میں نہ تھا دوسری جماعت شراب کی دوکانوں پر جانے کو تیار تھی۔ وشومبھر اس میں بھی نہ تھا آخر کار روپ متی نے سکریٹری سے وشومبھر کے بارے میں دریافت کیا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ دیہات میں کام کرنے کا ذمہ لیا ہے اور وہ آج شام میں سات بجے کی گاڑی سے جا رہا ہے روپ متی باہر نکل گئی۔ اور اسٹیشن کا رخ کیا۔ ابھی گاڑی جانے میں دیر تھی اس نے اسٹیشن میں داخل ہو کر وشومبھر کو تلاش کرنا شروع کیا تو وشومبھر پلیٹ فارم پر ہی کھڑا تھا۔ روپ متی کو دیکھتے ہی اس کے پاس چلا آیا اور بولا تم یہاں کیسے آ گئیں۔ روپ متی نے آنند سے ملاقات کا ذکر کیا اور کہنے لگی تم اپنے اس ارادے کو ترک کر دو اب لوٹ چلو"

وشومبھر نے کہا۔ یہ دوست کا مشورہ نہیں ہے، روپ متی! مجھے یقین ہے یہ بات تم دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ ذرا سوچو میری جان کی قیمت کیا ہے ایم اے پاس کرنے کے بعد بھی سو روپے کی ملازمت بہت بڑھا تو تین چار سو تک پہنچ جاؤنگا اس کے بدلے یہاں کیا ملے گا جانتی ہو سارے ملک کے لئے سوراج اتنے عظیم الشان مقصد کیلئے مر جانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے،،

روپ متی کے دل پر ان باتوں کا گہرا اثر پڑا اور وہ وشومبھر کے ان اثر پذیر الفاظ میں کھو سی گئی اور اس نے اس کی طرف عقیدتمندانہ انداز سے دیکھکر کہا۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔

وشومبھر نے کہا۔ نہیں تم میرے ساتھ نہ چل سکوگی۔ روپ متی نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں دیہات میں نہ رہ سکوں گی وشومبھر کے پاس ایک بڑا سبب یہ بھی تھا مگر اس نے انکار کردیا۔

نہیں یہ بات تو نہیں ہے روپ متی"

روپ متی:۔ تو پھر کیا بات ہے۔ کیا اندیشہ ہے کہ والد صاحب مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ مجھے اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں' وشومبھر نے دیکھا روپ متی کے چاند سے چہرے پر آہنی ارادہ کی روشنی چمک رہی ہے وہ اس ارادہ کے سامنے کانپ اٹھا۔ بولا میری خاطر تمہیں یہ ارادہ ترک کر دینا ہوگا۔
روپ متی سر جھکا کر بولی اگر یہ تمہارا حکم ہے تو میں اس کی تعمیل کروں گی جاؤ مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔ قانون کے پنجے میں اسی وقت آنا جب تمہاری اصول پرستی پر حرف آتا ہو۔ میں تمہاری کامیابی کے لئے پرارتھنا کرتی رہوں گی۔

گاڑی نے سیٹی دی۔ وشومبھر اندر جا بیٹھا۔ گاڑی چلی گئی۔ روپ متی گویا کائنات کی دولت آنچل میں لئے کھڑی رہی۔

روپ متی کے پاس وشومبھر کا ایک پرانا بوسیدہ سا فوٹو الماری کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ آج اسٹیشن سے لوٹ کر اس نے اسے نکالا اور اسے ایک خوبصورت فریم میں لگا کر میز پر رکھدیا۔ آنند کا فوٹو وہاں سے ہٹا دیا گیا دوسرے دن اخبار آیا تو روپ متی اس پر ٹوٹ پڑیں وشومبھر کا نام دیکھکر وہ مسرت سے پھول اٹھی۔ دن میں ایک مرتبہ سوراج بھون جانا اس کا معمول ہوگیا جلسوں میں برابر شریک ہوتی عیش و آرام کی تمام اشیاء ایک ایک کرکے پھینک دیں۔ ریشمی ساڑیوں کی جگہ گاڑھے کی ساڑھیاں آئیں چرخہ بھی آیا وہ گھنٹوں بیٹھی سوت کاتا کرتی تھی۔

اور پھر ایک روز پوسٹ مین نے اخبار لاکر میز پر رکھ دیا۔ روپ متی نے بے صبری سے اسے کھولا۔ پہلے عنوان پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں جیسے سرور چھا گیا اور چہرے پر ایک عجیب قسم کا نور برسنے لگا۔ اس نے جوش سے کھڑے ہو کر آنند سے کہا جو اتفاق سے روپ متی سے ملنے کیلئے آیا تھا۔ وہ کہنے لگی وشو میھر گرفتار ہو کر دو سال کیلئے جیل چلے گئے رانی گنج میں جلسہ تھا وہیں پکڑے گئے ہیں۔"

آنند نے کہا۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔ دو سال کیلئے جائیں گے زندگی خراب کر ڈالی"

روپ متی نے سرد مہری سے کہا۔ کیا ڈگری لے لینے سے ہی آدمی کی زندگی شاندار بنتی ہے۔ کیا سارا علم، سارا تجربہ کتابوں ہی میں بھرا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے انسانی فطرت کا جس قدر عملی تجربہ وشو میھر کو دو سال میں ہو جائے گا اتنا تجربہ فلسفہ اور منطق کی کتابوں سے تمہیں دس سال میں بھی نہ ہوگا اگر تعلیم کا مقصد کیرکٹر ہے تو ملکی تحریک میں اس کے جس قدر ذرائع ہیں وہ پیٹ کی لڑائی میں کبھی نہیں ہو سکتے تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہمارے لئے پیٹ کی فکر ہی بہت ہے تو میں مان لوں گی لیکن ملک و قوم کی خدمت کرنے والوں کو بے وقوف بنانا میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔"

آنند:۔ آج وشو میھر کو مبارک باد دینے کیلئے جلسہ ہوگا۔ جاؤ گی؟

روپ متی نے خود سرانہ انداز میں کہا۔ ضرور جاؤں گی۔ میں تو لیکچر بھی دوں گی کل رانی گنج چلی جاؤں گی۔ وشو میھر نے جو چراغ روشن کیا ہے۔ میری زندگی میں بجھنے نہ پائے گا۔

شکار

وسودھا کو راجہ کے محل میں آئے پانچ سال گذر گئے تھے پہلے وہ اپنی خوش نصیبی

پر کبھی نہ سماتی تھی ماں باپ کے چھوٹے سے گھر کو چھوڑ کر وہ اس محل میں آ گئی تھی جہاں دولت اس کے پیر چومتی تھی اس وقت دولت ہی اس کی آنکھوں میں سب کچھ تھی شوہر کی محبت دوسرے درجہ پر تھی۔ لیکن اس کا حریص دل دولت پر مطمئن نہ رہ سکا شوہر کی محبت کیلئے ہاتھ پھیلانے لگا۔ کنور گجراج سنگھ خوبصورت تھے تندرست تھے تعلیم یافتہ تھے مگر بیوی سے محبت کرنا نہیں جانتے تھے ازدواجی زندگی گذارنے کے باوجود بھی ان کو بیوی کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا۔ گھوڑدوڑ اور شکار جیسے ولولہ انگیز مشاغل کے درمیان وقت گذارتے تھے اور وسودھا کا دل اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتا تھا۔ وہ چاند سے بچے پاکر بھی وہ خوش نہ تھی کنور صاحب ایک مہینہ سے زیادہ ہوا شکار کے لیے گئے اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے تھے سال میں تین تین چار چار مہینے شکار کی نذر ہو جاتے تھے شکار سے لوٹتے تو گھوڑ دوڑ کا راگ چھڑ جاتا۔ کبھی میرٹھ۔ کبھی پونا، کبھی بمبئی، کبھی کلکتہ۔ گھر پر کبھی رہتے تو رئیس زادوں کے ساتھ گپ شپ اڑایا کرتے۔ شوہر کے کرتوت دیکھکر وسودھا دل ہی دل میں کڑھتی اور گھلتی جاتی تھی کچھ دنوں سے ہلکا ہلکا بخار بھی آنے لگا تھا۔ جب کنور صاحب کو ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تو وسودھا نے سفر کی تیاری کرنی شروع کر دی اس نے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا تصفیہ کر لیا۔ وہ قابل رحم زندگی بسر نہ کرے گی وہ جاکر کنور صاحب سے کہے گی اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی دولت کی لونڈی بن کر رہوں تو یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ آپ کی شان و شوکت آپ کو مبارک ہو۔ میرا اختیار آپکی دولت پر نہیں آپ پر ہے وسودھا کے دل میں پانی کے بلبلوں کی طرح یہ سب باتیں اٹھ رہی تھیں ریل گاڑی سے جانے میں آخری اسٹیشن سے دس کوس تک غیر آباد جنگلی راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ اسی لئے کنور صاحب ہمیشہ موٹر ہی سے جایا کرتے تھے

وسودھا نے بھی اسی راستہ سے جانے کا فیصلہ کیا۔ راہ میں بچوں کی یاد اس کو برابر ستا رہی تھی کئی مرتبہ خواہش ہوئی گھر لوٹ چلوں۔ جب انہیں میری پرواہ نہیں تو میں ہی کیوں ان کے لئے جان دوں، خواہ آئیں یا نہ آئیں پھر خیال آیا ایک مرتبہ جا کر کھری کھری سنا آؤں تو چین پڑے سارا جسم تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ بخار بھی ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ رات کے دس بجے ڈاک بنگلے میں پہنچی تو اسے تن بدن کی سدھ نہ تھی۔

موٹر کی آواز سنتے ہی کنور صاحب باہر نکل آئے اور پوچھا تم یہاں کیسے آ گئے خیریت تو ہے۔ ڈرائیور نے کہا حضور میں تو حکم کا بندہ ہوں جو حکم ملا اس پر عمل کیا کنور صاحب نے ڈانٹ کر کہا چپ رہو۔ باتیں نہ بناؤ" ڈرائیور نے قریب آ کر کہا رانی صاحبہ موٹر میں بے ہوش ہو گئی ہیں ان کو راہ میں بخار آ گیا "

کنور صاحب جھلاتے ہوئے وسودھا کے پاس گئے اور آہستہ سے پکارا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو انھوں نے آہستہ سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، پیشانی توے کی طرح تپ رہی تھی اس بخار کی آنچ نے گویا ان کے غصہ کی آگ کو سرد کر دیا لپک کر بنگلے میں گئے سوئے ہوئے آدمیوں کو جگایا۔ پلنگ بچھوایا۔ بے ہوش وسودھا کو گود میں اٹھا کر اندر لے گئے اور پلنگ پر لٹا دیا پھر اس کے سرہانے بیٹھ کر اسے اشک آلود نگاہوں سے تاکنے لگے اس کے گرد سے بھرے ہوئے چہرے اور بکھرے ہوئے بالوں میں آج انہیں بے غرض محبت نظر آئی آج تک انھوں نے وسودھا کو خود پرست نازنین کے روپ میں دیکھا تھا جسے ان کی پیار کی پرواہ نہ تھی جو اپنے بناؤ سنگار میں مست تھی آج گرد و غبار کے پوڈر میں انہوں نے اسکی نسائیت دیکھی اس میں کتنی حسرت تھی اور کتنی التجا تھی آج کنور صاحب کو اس کا اندازہ ہوا۔

وسودھا کا بخار بارہ دن تک نہ اترا۔ گھر سے ڈاکٹر آئے، دونوں بچے نوکر چاکر سب ہی آ گئے، جنگل میں منگل ہو گیا۔ وسودھا پلنگ پر پڑے کنور صاحب کی تندہی اور خدمت گذاریاں دیکھتی اور خوش ہوتی تھی

دس بجے تک جس کی آنکھ نہ کھلتی تھی۔ وہی کنور صاحب اب منہ اندھیرے اٹھ بیٹھتے تھے اور اس کے دوا دارو کی فکر کرنے لگتے تھے ان کی صحت بگڑتی جاتی تھی چہرے پر وہ سرخی اور چمک نہ تھی تھکے تھکے معلوم ہوتے تھے۔

ایک دن وسودھا نے پوچھا۔ آپ آج کل شکار کھیلنے کیوں نہیں جاتے ہیں تو شکار کھیلنے ہی آئی تھی نہ جاتے کیسی بری ساعت میں چلی کر آپ کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی ۔۔۔۔ ذرا آئینہ میں اپنی صورت تو دیکھو وسودھا کے منہ سے شکار کا ذکر سن کر ان کا سر ندامت سے جھک گیا آہستہ سے بولے۔ ہاں" شکار کھیلنے کا اس سے اچھا کون سا موقع ملے گا۔

وسودھا بولی۔ میں تو اب بالکل اچھی ہوں۔ اب کے آپ کے ساتھ میں بھی شکار کھیلنے چلوں گی۔ اور ہاں! اب کے آپ نے کیا کیا تحفے جمع کئے ذرا منگواؤ میں بھی دیکھوں"

کنور صاحب کو اپنے شکاری تحفے دکھانے کا مرض تھا۔ سینکڑوں کھالیں جمع کر رکھی تھیں۔ ان کے کمروں میں فرش، گدے، کوچ، کرسیاں، مونڈھے سب کھالوں کے تھے۔ اوڑھنا اور بچھونا بھی کھالوں کا ہی تھا۔ کھالوں کے کئی سوٹ بنوا رکھے تھے، شکار کے موقع پر وہی سوٹ پہنتے تھے۔ اب کے بھی بہت سے سینگ، پنجے کھالیں جمع کی تھیں۔ وہ وسودھا کی خواہش پر ان چیزوں کو اٹھا لائے اور ایک ایک کر کے اس کو دکھانے لگے وسودھا کے چہرہ پر ایسی رونق ہفتوں سے نہ تھی جو آج تھی۔

اور ایک دن وسودھا نے کنور صاحب سے کہا۔ مجھے بھی بندوق چلانا سکھا دو۔ اور کنور صاحب نے اس کی اس خواہش کو پوری کر دیا وسودھا تندرست ہو گئی تھی اور کنور صاحب نے اس کو نشانہ بازی کی مشق کرانے لگے اور جس دن وسودھا نے پہلا باز شکار کیا۔ کنور صاحب مسرت سے اچھل پڑے، نوکروں کو بخشش دی گئی برہمنوں کو دان اس خوشی کی یاد میں باز کی ممی بنوائی گئی وسودھا کی زندگی میں اب ایک نئی امنگ نئی راحت، ایک نئی امید تھی۔ پہلے کی طرح اس کا خالی دل اندیشوں سے نہ کانپتا تھا۔ اب اس میں حوصلہ تھا قوت تھی محبت تھی۔

آخر کئی دنوں کے بعد وسودھا کی تمنا پوری ہوئی۔ کنور صاحب اسے شیر کے شکار میں اپنے ساتھ لے چلنے کے لئے تیار ہوئے اور شیر بھی وہ تھا جس نے ایک مہینہ سے گاؤں کے اطراف قیامت برپا کر رکھی تھی۔

جنگل میں چاروں طرف تاریکی تھی دونوں ایک بلند مچان پر بندوقیں لئے دم روکے بیٹھے تھے۔ یہ شیر نہایت خوفناک تھا۔ اس شیر کی گھات میں دونوں شکاری بیٹھے تھے۔ نیچے کچھ فاصلے پر بھینسا باندھ دیا گیا تھا اور شیر کے آنے کی راہ دیکھی جا رہی تھی۔ کنور صاحب مطمئن تھے مگر وسودھا کا دل دھڑک رہا تھا ذرا سا پتہ بھی ہلتا تو وہ چونک پڑتی۔ کنور صاحب اس کی ہمت بندھاتے جاتے تھے جوں ہی شیر بھینسے پر آیا۔ میں اس کا کام تمام کر دوں گا۔ تمہاری گولی کی نوبت ہی نہ آنے پائے گی۔

تھوڑی دیر بعد بھینسے کے قریب دو چنگاریاں چمک اٹھیں کنور صاحب نے آہستہ سے وسودھا کا ہاتھ دبا کر اسے شیر کے آنے کی اطلاع دی اور ہوشیار ہو گئے جب شیر نزدیک آگیا تو انھوں نے بندوق داغ دی نشانہ خالی گیا۔ دوسرا فیر کیا شیر زخمی تو ہوا مگر گرا نہیں غصہ سے پاگل ہو کر اس قدر زور سے

گرجا کہ وسودھا کا کلیجہ دہل گیا کنور صاحب تیسرا فیر کرنے کو ہی تھے کہ شیر نے مچان پر جست ماری۔ اس کے اگلے پنجوں کے دھکے سے مچان ایسا ہلا کہ کنور صاحب بندوق لیئے مچان سے گر پڑے۔ کتنا نازک موقع تھا۔ اگر ایک لمحہ کی بھی دیر ہو جاتی تو کنور صاحب کی خیر نہ تھی۔ شیر کی جلتی ہوئی انگارہ سی آنکھیں وسودھا کے سامنے چمک رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ لیکن اس خطرہ نے جیسے اس کی نس نس میں بجلی بھر دی اس نے اپنی بندوق سنبھالی۔ شیر کے اور اس کے درمیان دو ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ وہ اُچک کر آیا ہی چاہتا تھا کہ وسودھا نے بندوق چھوڑ دی۔ شیر کے پنجے ڈھیلے پڑ گئے۔ اور وہ نیچے گر پڑا۔ اب صورت حال اور بھی خطرناک تھی۔ شیر سے تین چار قدم پر کے فاصلے پر کنور صاحب گرے تھے شاید چوٹ زیادہ آئی ہو۔ شیر میں اگر ابھی دم ہے تو ضرور ان پر حملہ کرے گا وسودھا کی جان آنکھوں میں تھی۔ ریوالور ہاتھ میں اس وقت اگر کوئی اس کے جسم میں نیزہ بھی چبھو دیتا تو اسے خبر نہ ہوتی وہ اپنے ہوش میں نہ تھی۔ لیکن وہ بڑی ہمت سے ٹارچ جلائی اور دیکھا کہ شیر اٹھنے کی کوشش کر رہا ہے دوسری گولی سر پہ ماری اور ریوالور لیئے مچان پر سے کود پڑی شیر زور سے غرایا وسودھا نے اس کے منہ کے سامنے ریوالور خالی کر دیا۔ کنور صاحب سنبھل کر کھڑے ہو گئے اور دوڑ کر وسودھا کو چھاتی سے لگا لیا لیکن وسودھا بے ہوش ہو چکی تھی۔

تین گھنٹوں کے بعد وسودھا کو ہوش آیا۔ لیکن گھبراہٹ ابھی تک باقی تھی اس نے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کنور صاحب نے ہنس کر کہا۔ شیر کب کا ٹھنڈا ہو گیا برآمدہ میں پڑا ہے اتنا بڑا شیر میں نے کبھی نہیں دیکھا دوسرے دن جنگل سے کوچ ہوا اور جو محل وسودھا کو پھاڑے کھاتا تھا اس میں جا کر آج اسکو دلی مسرت ہوئی ہر ایک چیز اسکا خیر مقدم کرتی معلوم ہوتی تھی

جن نوکروں اور لونڈیوں سے ہمینوں سید ھے منہ بات بھی نہ کرتی تھی ان سے ہنس ہنس کر بولتی تھی۔ دسودھا کی خوشی اور مسرت کا راز یہی تھا کہ اس نے ایک مدت کے بعد کنور صاحب کے دل کو موہ لیا تھا۔ اس کو شوہر کا محبت اور پیار مل چکا تھا جس سے وہ کئی عرصہ تک محروم تھی۔

آخری حیلہ

میری بیوی میکہ میں ہے اور اس کا میکہ ایک دیہات میں ہے اور میں شہر میں مقیم ہوں لیکن ادھر کچھ دنوں سے بیوی نے پیہم تقاضے کرنے شروع کئے کہ مجھے بلا لو۔ میں چھٹیوں میں وہاں جایا کرتا تھا تو میرا صرف کہاں چلو گی" کہدینا اس کے اطمینان قلب کیلئے کافی ہوتا تھا پھر میں نے فضول ہے" کہکر تسکین دینا شروع کیا اس کے بعد خانہ داری کی پریشانیوں سے تخویف کی۔ مگر اب کچھ دنوں سے اس کی بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے۔ اب میں نے چھٹیوں میں بھی اس کے تقاضے کے خوف سے گھر جانا بند کر دیا ہے۔ کہ کہیں وہ میرے ساتھ نہ چل کھڑی ہو اور انواع واقسام کے حیلوں سے اسے ڈراتا ہوں۔

میرا پہلا حیلہ اخبار نویس کی زندگی کی مشکلات سے متعلق تھا بے انتہا تکلیف وہ کبھی بارہ بجے رات کو سونا نصیب ہوتا ہے کبھی ساری رات لکھنا پڑتا ہے صبح ہوتے ہی وہ ہنگامہ آرائی اس پہ طرہ یہ کہ سر پر ایک برہنہ تلوار لٹکتی رہتی ہے نہ جانے کب گرفتار ہو جاؤں کب ضمانت طلب ہو جائے۔ خفیہ پولیس کی ایک فوج ہمیشہ پیچھے پڑی رہتی ہے کبھی بازار میں نکل جاتا ہوں تو لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہتے ہیں وہ جا رہا ہے اخبار والا۔ دنیا میں جتنی آفات ارضی سماوی نسلی و مذہبی ملکی و قومی ہیں ان کا ذمہ دار میں ہوں گویا میرا دماغ جھوٹی خبریں

گھڑنے کا کارخانہ ہے سارا دن افسروں کی سلامی اور پولیس کی خوشامد میں گزر جاتا ہے۔ کانسٹبلوں کو دیکھا اور روح فنا ہوئی کہ خدا جانے کیا آفت برپا کریں میری تو یہ حالت اور حکام بیا کہ میری صورت سے ہراساں۔

میں نے اس خط میں اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر مطلق نہیں کیا کیونکہ میں جنس لطیف سے ایسا تذکرہ کرنا اپنی شان مردانگی کے خلاف سمجھتا ہوں مجھے یقین تھا کہ اہلیہ اس خط کے بعد پھر یہاں آنے کیلئے اصرار نہ کریگی مگر یہ خیال غلط نکلا اور ان کے تقاضے بدستور قائم رہے تب میں نے دوسرا حیلہ سوچا شہروں میں بیماریوں کی گرم بازاری ہے ہر ایک کھانے پینے کی چیز میں سمیت کا اندیشہ ہے یہاں انسان کی زندگی نقش بر آب ہے جسے آج دیکھو، وہ کل غائب اچھے خاصے بیٹھے ہیں دل کی حرکت بند ہوگئی گھر سے سیر کرتے نکلے موٹر سے ٹکرا کر راہی عدم اگر کوئی شام کو زندہ سلامت گھر آجائے تو اسے خوش نصیب سمجھو مچھر کی آواز کان میں آئی اور دل بیٹھا مکھی نظر آئی تو ہاتھ پاؤں پھولے۔ چوہا بل سے نکلا اور جان نکل گئی۔ جدھر دیکھئے ملک الموت اگر موٹر سے بچ کر آ گئے تو مچھر اور مکھی کے شکار ہوں بس سمجھ لو موت ہر دم سر پر کھیلتی رہتی ہے ساری رات مچھروں سے جنگ کرتے گزرتی ہے دن بھر مکھیوں سے لڑتا ہوں ننھی سی جان کو کن کن دشمنوں سے بچاؤں سانس بھی مشکل سے لیتا ہوں کہ کہیں کوئی تپ کا کیڑا پھیپھڑے ہی نہ داخل ہو جائے وغیرہ وغیرہ۔

بیوی کو پھر یقین نہ آیا دوسرے خط میں بھی وہی آنے کا اصرار موجود تھا اس پر میں نے ایک تیسرا حیلہ سوچ نکالا اور لکھا کہ یہاں دوستوں کے مارے جان عذاب میں رہتی ہے احباب اگر بیٹھ جاتے تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے اور نوکر سے سگریٹ ناشتہ ادھار منگوا کر کھاتے ہیں۔ دینا مجھے پڑتا ہے۔

بعض تو ہفتوں پڑے رہتے ہیں ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے روزانہ ان کی خاطر و مدارات کرو شام کو تھیٹر یا فلم دکھاؤ۔ رات کو ایک دو بجے تک تاش یا شطرنج کھیلو اکثر احباب شراب کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے اکثر تو بیمار ہو کر آتے ہیں بلکہ زیادہ تر بیمار ہی آتے ہیں اب روزانہ ڈاکٹر کو بلاؤ تیمار داری کرو رات بھر سرہانے بیٹھے پنکھا جھلتے رہو۔ میری گھڑی میری کلائی پر مہینوں سے نہیں آئی دوستوں کے ساتھ جلسوں میں شرکت ہو رہی ہے اچکن ہے تو وہ ایک صاحب کے پاس کوٹ دوسرے صاحب لے گئے جوتا ایک اور بابو لے اڑے ہیں وہی پرانا کوٹ اور وہی خارج شدہ جوتا پہن کر دفتر جاتا ہوں پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی ہے تو چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر آتا ہوں کہ کہیں کوئی صاحب اس لئے میرے منتظر نہ بیٹھے ہوں کہ آج ضرورت ہے کچھ روپے دے دو۔

مجھے یقین تھا کہ اس خط کے بعد بیوی پھر یہاں آنے کا نام نہ لے گی مگر اب کی بار پھر وہ خیال غلط نکلا جواب میں وہی تقاضہ تھا خیریت اتنی ہوئی کہ انھوں نے خط لکھنے پر ہی اکتفا کیا۔

تب میں نے چوتھا حیلہ سوچا۔ یہاں کے مکان ہیں کہ خدا کی پناہ ہوا نہ روشنی نہ وسعت نہ کشادگی وہ غضب کا تعفن کہ دماغ پھٹا جاتا ہے۔ کتنوں کو تو اسی تعفن اور بدبو کے باعث مالیخولیا، اختلاجِ قلب یا ٹائیفائیڈ ہو جاتا ہے۔ بارش ہوئی اور مکان ٹپکنا شروع ہوا۔ پانی آدھ گھنٹے برسے مکان رات بھر رستا رہتا ہے رات بھر مکانوں کے گرنے کی صدا آتی رہتی ہے رات کو وحشت ہوتی رہتی ہے ایسے بہت کم مکان ہوں گے جن میں پلید ارواح کا گذر نہ ہو ہولناک خواب دکھائی دیتے ہیں لوگ رات کو رو پڑتے ہیں چیخ اٹھتے ہیں کتنے ہی جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں آج گھر میں آئے

کل مکان تبدیل کرنے کی فکر پیدا ہو گئی۔

مگر میری بیوی پر ایسا جادو چڑھا ہوا تھا کہ میرا کوئی حیلہ اسے خوفزدہ نہیں کرتا تھا۔ اس خط کے جواب میں اس نے لکھا کہ تم مجھ سے بہانے کرتے ہو اور خود وہاں سیر سپاٹے کا لطف اٹھاتے ہو میں ہرگز نہ مانوں گی آکر مجھے لے جاؤ۔

آخر مجھے پانچواں حیلہ کرنا پڑا۔ یہ خوانچے والوں کے متعلق تھا۔ ابھی بستر سے اٹھنے کی نوبت نہیں آئی کہ کانوں میں عجیب و غریب صدائیں آنے لگیں وہ اسطرح شیطانی صدائیں نکالتے ہیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور بچے ماں کی گود سے چمٹ جائیں کئی احباب اپنی بیویوں کو لائے مگر بیچاریاں دوسرے ہی دن ان صداؤں سے خائف ہو کر واپس چلی گئیں۔

مگر بیوی نے اسے بھی میرا حیلہ ہی سمجھا اور لکھا کہ تم سمجھتے ہو کہ میں خوانچے والوں کی آواز سے ڈر جاؤنگی۔ دیہات میں گیدڑوں اور الوؤں کا شور سن کر تو ڈرتی نہیں۔ خوانچے والوں کی آواز سے ڈر جاؤنگی مجھے ایسی باتوں سے نہ ڈرایئے

آخر میں نے اب کی بار کوئی ایسا حیلہ سوچ نکالنے کی ٹھانی۔ جو اس خوف کا خاتمہ کر دے۔ بیوی کو شہری زندگی سے مدت العمر کیلئے نفرت ہو جائے کئی دنوں کے بعد مجھے ایک حیلہ سوجھا۔ اگرچہ اس میں کچھ رسوائی کا بھی اندیشہ تھا۔ لیکن رسوائی ہو جانے کا کوئی غم نہیں وہ مصیبت تو سر پر نہ پڑے

میں نے لکھا کہ شریف زادیوں کے رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں کی عورتیں اتنی بد زبان ہیں کہ باتوں کا جواب گالیوں سے دیتی ہیں اور ان کی وضع قطع کا کیا پوچھنا۔ شریف زادیاں تو ان کا ٹھاٹھ دیکھکر شرم سے پانی پانی ہو جاتی

ہیں۔ انہیں تو بناؤ سنوار کے دوسرا کام ہی نہیں۔ روز نئی سج، دھج، نت نئی ادا، اور شوخ تو اس غضب کی ہیں کہ گویا پارہ بھر دیا گیا ہو۔ ان کا چمکنا۔ مٹکنا، لجانا اور مسکرانا دیکھ کر بیچاری بھلے گھروں کی عورتیں شرما جاتی ہیں۔ اور ایسی گستاخ کہ خواہ مخواہ گھروں میں گھس پڑتی ہیں۔ اجی اکثر تو خط لکھانے کے بہانے سے گھروں میں آجاتی ہیں اور خواہ مخواہ گھر والیوں کو جلاتی ہیں۔ معلوم نہیں اس خط میں مجھ سے کون سی غلطی ہو گئی کہ تیسرے ہی دن بیوی صاحبہ نے اپنے تینوں بچوں کو لئے ایک بلائے بے درماں کی طرح آگئیں اور آتے ہی کہنے لگیں گھر میں کوئی چڑیل بیٹھی تو نہیں ہے؟

یہاں کسی نے قدم رکھا تو ناک ہی کاٹ لوں گی اس کی۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ میرا آخری بہانہ ہی میری بیوی کے آنے کا باعث ہوا گویا اپنا طمانچہ اپنے ہی منہ پہ پڑا۔

ستی

ملیا ایک خوبصورت عورت تھی۔ لیکن اس کا شوہر کلوا انتہائی بد صورت تھا۔ دونوں میں حد سے زیادہ پیار اور محبت تھی اور وہ ایکدوسرے پہ جان دیتے تھے گویا ایک جان دو قالب والی بات ان پر صادق آتی تھی گاؤں میں کتنے ہی نوجوان ہیں جو ملیا سے چھیڑ کیا کرتے تھے مگر اس کی نظر میں بد صورت کلو دنیا کے ہر انسان سے بہتر تھا۔ ایک دن راجہ نے کہا بھابی! بھیا تمہارے قابل نہیں ہیں۔ ملیا نے فوراً جواب دیا قسمت میں تو وہی لکھے تھے۔ تمہیں کیونکر پاتی۔

تیج کے دن کلو، ملیا کیلئے لٹھے کی ساڑھی لایا۔ جی تو چاہتا تھا کہ کوئی

عمدہ ساڑھی لے مگر روپے نہ تھے اور بزاز نے ادھار نہ مانا۔ راجہ بھی اسی دن قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ ایک عمدہ سی چندری میں لاکر ملیا کی نذر کی۔ اس نے پہلے تو انکار کیا۔ لیکن بعد میں راجہ کا دل رکھنے کیلئے اس نے وہ چندری اٹھا سے لے لی۔ راجہ نے اس موقع کو غنیمت جان کر ملیا سے کہا۔ ابھی تو بھیا نہیں ہیں، ذرا پہن لو۔ ملیا نے اندر جاکر چندری پہن لی اور پھر باہر نکل آئی۔ راجہ نے اس کو دیکھکر کہا، ایسا جی چاہتا ہے کہ تمہیں لے کر کہیں بھاگ جاؤں" ملیا نے فوری جواب دیا جانتے ہو تمہارے بھیا کا کیا حال ہوگا۔ یہ کہکر کواڑ بند کر لئے۔

ملیا کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ چندری کلو کو دکھا دے۔ مگر نتیجہ سوچ کر ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس نے چندری رکھ لی؟ اسے خود پر غصہ آرہا تھا۔

لیکن راجہ کو کتنا رنج ہوتا؟ کیا ہوا اس کی چندری ذرا دیر پہن لیتے سے اس کا دل تو رہ گیا۔ لیکن کیا یہ کلو کے ساتھ دغا نہیں تھی؟ اس کا دل اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا۔

رات میں جب کلو آیا تو اس نے ملیا سے پوچھا۔ آج راجہ کیا کرنے آیا تھا؟ ملیا کا بدن کانپنے لگا۔ بہانہ کر کے بولی۔ تمباکو مانگنے آئے تھے۔

کلو نے کہا۔ اسے اندر مت آنے دیا کرو، اچھا آدمی نہیں ہے"

ملیا:۔ میں نے کہدیا تمباکو نہیں ہے تو چلے گئے" کلو نے کسی قدر تیز ہو کر کہا"۔ کیوں جھوٹ بولتی ہو؟ وہ تمباکو مانگنے نہیں آیا۔ وہ جانتا ہے میرے گھر میں تمباکو نہیں ہے۔ میں تمباکو کیلئے خود ہی اس کے گھر گیا تھا"

ملیا کے بدن میں کاٹو تو خون نہیں۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا اسر جھکا کر بولی میں کسی کے من کا حال کیا جانوں؟

آج تیج کا برت تھا۔ ملیا اپوجا کا سامان کر رہی تھی۔ لیکن اس طرح گویا اس کے دل میں ذرا بھی اعتقاد، ذرا بھی شوق نہیں ہے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا اس کے منہ پر کالکھ پت گئی ہے۔ اور اب وہ کلو کی آنکھ سے گر گئی ہے۔ اسے اپنی زندگی ویران نظر آنے لگی اور جب وہ رات میں سو گئی تو ایک خوفناک خواب دیکھی کہ کلو مر گیا ہے اور راجہ گھر میں گھس کر اسے پکڑنا چاہتا ہے اسی وقت ایک بوڑھی عورت نہ جانے کدھر سے آکر کہتی ہے کہ تو نے ہی کلو کو دغا کی کٹار سے ہلاک کر دیا ہے اس خواب سے وہ چونک کر بیدار ہو جاتی ہے اور کلو کو سامنے صحن میں سوتا ہوا پاتی ہے اور ملیا دوڑتی ہوئی اس کے پاس گئی اور اس کی چھاتی پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کلو نے گھبرا کر پوچھا کون ہے؟

مولا کیوں روتی ہو؟ کیا ڈر گئیں؟ میں تو جاگ ہی رہا ہوں"

ملیا نے اس سے راجہ کی چندری لینے کا واقعہ سنایا۔ اور کلو اس دن سے کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ ملیا نے اس کے ساتھ جتنی دغا کی تھی اس سے کہیں زیادہ اس نے سمجھ لیا، اور یہی شبہ اس کے دل میں سرطان کی طرح چمٹ گیا وہ اس غم کو مٹانے کیلئے کبھی کبھی تاڑی خانہ چلا جاتا یا چرس کا دم لگاتا ملیا اس کی یہ حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی وہ اس شبہ کو اس کے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔

اس نے دل و جان سے اس کی خدمت کرتی۔ اسے خوش رکھنے کی مسلسل کوشش کرتی۔ مگر وہ جتنا ہی اسے کھینچنے کی کوشش کرتی اتنا ہی دور وہ اس سے ہوتا جاتا تھا۔ اور ایک دن کلو رات کو گھر لوٹا تو اس کو بخار تھا دوسرے دن اس کے جسم میں دانے نکل آئے اور پھر یہ دانے بڑھ کر آبلے ہو گئے اور

معلوم ہوا یہ گرمی ہے۔ کلّو کی خدمتی یہ رنگ لائی تھی۔ لیکن ملیا نے اس کی تیمار داری میں دن رات ایک کر دی۔ دیہات میں جس طرح کا علاج ہو سکتا تھا وہ ملیا کرتی تھی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اور کلو کی حالت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔

ایک دن ملیا کھانا پکا رہی تھی کہ راجہ نے رسوئی خانہ کے دروازے پر آکر کہا۔ بھابی کیا اب بھی مجھ پر مہربانی نہ ہوگی۔ ملیا نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ چولہے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔" لالہ تمہارے پیروں پڑتی ہوں، یہ ساری مصیبت تمہاری ہی لائی ہوئی ہے تم ان کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہو۔ اجلے کپڑے اور چکنے مکھڑے سے کوئی آدمی نہیں ہو جاتا، میری آنکھوں میں تو اب ان کے سامنے کوئی جچتا نہیں۔"

کلو نے پکارا،" مولا تھوڑا پانی دے ملیا پانی لے کر دوڑی اور چلتے چلتے راجہ کے کرن پھول کو جو اس نے ملیا کیلئے لایا تھا۔ ایسی ٹھوکر لگائی کہ وہ صحن میں جا گرے۔ راجہ نے جلدی سے کرن پھول اٹھائے اور غصہ میں چلا گیا۔

ایک روز کلو نے ملیا سے پوچھا۔ سچ کہہ مولا راجہ اور تم میں کیا معاملہ تھا۔ ملیا نے جواب دیا۔ میرے اور ان میں اگر کوئی معاملہ ہو تو بھگوان میری اس سے بری حالت کریں۔ اس نے مجھے چندری دی تھی وہ میں نے لے لی پھر میں نے اسے آگ میں جلا دیا۔"

کلو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا میں نے کچھ اور ہی سمجھ رکھا تھا نہ جانے میری سمجھ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ تمہیں پاپ لگا کر خود ہی پاپ میں پھنس گیا اور اب اس کا پھل بھوگ رہا ہوں، اس نے رو رو کر اپنی بے راہ روی

کا پردہ فاش کرنا شروع کیا اور ملیا آنسوؤں کی لڑیاں بہا بہا کر سننے لگی
کلو کی بیماری روز بروز بڑھتی گئی اور آخر ایک روز وہ اس دنیا کو چھوڑ
دیا۔ سارا گاؤں جمع ہوگیا سب ہی ملیا کو تسلی اور صبر کی تلقین کر رہے تھے لیکن
ملیا کو صبر نہ ہوتا تھا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ یہ بات اسے نہ بھولتی تھی
کلو کو مرے چھ ماہ ہوگئے تھے۔ اور ادھر راجہ کی عورت بھی مرگئی۔

مگر دو ہی چار دن میں وہ اپنی بیوی کی موت کا غم بھلا دیا اور پھر چھیلا
بنا گھومنے لگا۔ ایک روز ملیا کے گھر پہنچا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد
بولا۔ بھابی۔ اب تو میری امید پوری کروگی یا ابھی کچھ اور باقی ہے اب تو
بھیا بھی نہیں رہے اور ادھر میرے گھر والی بھی مرگئی۔ میں نے تو اس کا غم
بھلا دیا۔ تم کب تک بھیا کے نام کو روتی رہوگی؟

ملیا نے نفرت سے اسکی طرف دیکھکر کہا۔ بھیا نہیں رہے تو کیا ہوا بھیا
کی یاد تو ہے۔ ان کی صورت تو دل میں ہے۔ ان کی باتیں تو کانوں میں ہیں۔
میرے لئے وہ اب بھی ویسے ہی جیتے جاگتے ہیں۔ پہلے تو بدن کا تعلق تھا اب
تو وہ مجھ سے اور بھی قریب ہوگئے ہیں۔ اور جیوں جیوں دن گزریں گے اور
بھی قریب ہوتے جائیں گے۔ خبردار آج سے میرے گھر میں پاؤں مت رکھنا
نہیں تو جان سے ہاتھ دھوؤ گے نکل جاؤ میرے گھر سے۔

ملیا کے چہرے پر اتنا جلال اور لہجہ میں اتنی تندی تھی کہ راجہ کو زبان
کھولنے کی ہمت نہ ہوئی وہ چپکے سے گھر کے باہر نکل گیا۔

طلوعِ محبّت

بھوندو اور بنٹی دونوں کنجڑ خاوند بیوی تھے اور کئی کنجڑوں کے ساتھ ایک باغ میں اترے تھے۔ یہ لوگ خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ ان کا ایک ڈیرا ہوتا اور زندگی کا سارا ساز و سامان اسی میں رہتا۔ جب یہ کہیں بھی پڑاؤ ڈالتے تو وہاں کی پولیس آ کر انہیں اپنی نگرانی میں لے لیتی تھی۔

پڑاؤ کے اِرد گرد چوکیداروں کا پہرہ لگ جاتا تھا۔ عورت یا مرد کسی گاؤں میں جاتے تو پولیس کے آدمی ان کے ساتھ ہو لیتے رات کو ان کی حاضری لی جاتی۔ پھر بھی اطراف کے لوگ سہمے ہوئے تھے۔ کیونکہ کنجڑ لوگ اکثر گھروں میں گھس کر جو چیز چاہتے اٹھا لیتے اور ان کے ہاتھ میں جا کر کوئی شئے لوٹ نہ سکتی تھی۔ رات میں یہ لوگ اکثر چوری کرنے نکل جاتے چوکیدار ان سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ خونخوار تھے۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے۔ سختی کرنے میں جان کا خطرہ رہتا۔ کیونکہ کنجڑ لوگ بھی ایک حد تک ہی پولیس کا دباؤ مانتے تھے ساری بستی میں بھوندو ہی ایک ایسا شخص تھا جو اپنی محنت کی کمائی کھاتا تھا۔ مگر اس لئے کہ وہ پولیس والوں سے ڈرتا تھا بلکہ اس لئے کہ اس کی بہادری یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وہ ناجائز طریقے سے اپنی کسی ضرورت کو پورا کرے۔

بنٹی کو شوہر کی یہ پاکدامنی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی کیونکہ دوسری عورتیں نئی نئی چوڑیاں اور نئے نئے زیور پہنتیں تو بنٹی اپنے شوہر کی بزدلی پر کڑھتی تھی۔ اس بات پر دونوں میں کئی مرتبہ جھگڑے ہو چکے تھے لیکن بھوندو اپنی عاقبت بگاڑنے کو تیار نہ تھا۔

ایک روز بھوندو محنت مزدوری کر کے واپس آیا تو نیتی نے اس سے کہا
.... یہاں دھیلے دھیلے کی چیز کیلئے ترسنا پڑتا ہے۔ یہاں جتنی عورتیں ہیں سب
کھاتی ہیں۔ ہنستی۔ کھیلتی ہیں۔ پہنتی ہیں اوڑھتی ہیں۔ کیا میرے ہی دل نہیں ہے
تمہارے ساتھ بیاہ کر کے جندگی کھراب ہو گئی۔"

بھوندو نے ایک لمحہ سوچکر کہا۔ جانتی ہو؟ پکڑا گیا تو تین سال سے کم
کی سجا نہ ہو گی۔ نیتی پر اثر نہ ہوا۔ بولی۔ جب اور لوگ نہیں پکڑے جاتے تو
تم ہی کیوں پکڑے جاؤ گے"؟

بھوندو۔ اور لوگ پولیس کی کھوسامدیں کرتے ہیں اچوکیداروں
کے پاؤں سہلاتے ہیں۔ تو چاہتی ہے میں بھی یہ کرم کروں۔

نیتی نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ بولی۔ میں تمہارے ساتھ ستی ہونے نہیں آئی
جانور کو بھی جب گھاس چارہ نہیں ملتا تو رسا تڑا کر کسی کھیت میں جا گھتا
ہے میں تو آدمی ہوں"۔

بھوندو نے اس کا جواب نہ دیا۔ اسکی بیوی کوئی دوسرا گھر کرلے گی یہ
خیال بھی اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ آج نیتی نے پہلی مرتبہ یہ دھمکی
دی تھی۔ اب تک بھوندو اس طرف سے بے فکر تھا۔ اب یہ نیا خطرہ اس
کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا دن کبھی نہ آنے دے گا
وہ اس کے لئے سب کچھ کر گزرے گا۔ بھوندو کی نگاہوں میں نیتی کی وہ عزت
نہیں رہی وہ اعتماد نہیں رہا۔

اس کے دوسرے دن گاؤں کے ایک امیر ٹھاکر کے گھر چوری ہو گئی
اس رات بھوندو اپنے ڈیرے پر نہ تھا۔ نیتی نے چوکیدار سے کہا کل جنگل
سے نہیں لوٹا۔ صبح کے وقت بھوندو آ پہنچا اس کی کمر میں روپوں کی ایک تھیلی

تھی، کچھ سونے کے گہنے تھے۔ بنٹی نے گہنے ایک درخت کے نیچے گاڑ دیئے روپوں کی کیا پہچان ہو سکتی تھی۔

کھوندرو نے پوچھا۔ اگر کوئی پوچھے۔ اتنے سارے روپے کہاں سے ملے تو کیا کہو گی۔ بنٹی نے آنکھیں نچا کر کہا، کہہ دوں گی، کیوں بتاؤں دنیا کماتی ہے تو کسی کو حساب دینے جاتی ہے۔ ہم اپنا حساب کیوں دیں گا کھوندرو نے گردن ملا کر کہا یہ کہنے سے گلا نہ چھوٹے گا بنٹی! تو کہہ دینا میں کئی مہینے سے تین تین، چار چار روپے ماہوار بچاتی رہی ہوں ہمارا خرچ ہی کون سا بڑا لمبا ہے؟"

اس طرف سے بے فکر ہو کر دونوں بازار چلے، بنٹی نے اپنے لئے کئی قسم کے کپڑے، چوڑیاں، بندے، سیندور، پان، تمباکو، تیل اور مٹھائی لی۔ پھر دونوں شراب کی دکان پر گئے، خوب شراب پی۔ اور رات میں دیر سے ڈیرہ پر لوٹے۔

رات میں کھوندرو کو دیوی کی یاد آئی۔ آج تک اس نے کبھی دیوی کو بلیدان نہ دیا تھا۔ دیوی صرف ایک بکرا لے کر خوش ہو جائے گی اور اس خیال کے آتے ہی وہ بکرے کی تلاش میں گھر سے باہر نکلا اور بنٹی کو بھی اس کی خبر نہ دی۔

کھوندرو باہر نکلا، مگر بکرا کہاں ملے۔ آخر اس مشکل کو بھی اس نے ایک خاص طریقہ سے حل کیا۔

قریب کی بستی میں ایک گڈریئے کے پاس کئی بکرے تھے اس نے سوچا کہ وہیں سے ایک بکرا اٹھا لاؤں دیوی کو اپنی قربانی سے غرض ہے یا اس سے کہ بکرا کہاں سے آیا اور کیونکر آیا۔ لیکن بستی کے قریب پہنچا ہی

تھا کہ پولیس کے چاروں آدمیوں نے اسے گرفتار کر لیا اور مشکیں باندھ کر تھانے لے چلے۔

نیتی کھانا پکا کر بناؤ سنگار کرنے لگی۔ آج اسے اپنی زندگی گلزار معلوم ہوتی تھی۔ مسرت سے کھیل جاتی تھی اور پھر وہ بناؤ سنگار کر کے بھوندو کی راہ دیکھنے لگی۔ جب دیر ہو گئی تو وہ جھنجھلا اٹھی۔ رات گذر گئی لیکن بھوندو نہ آیا۔ نیتی شوہر کے انتظار میں ساری رات بیقرار رہی صبح جب وہ اٹھی تو ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا۔ اس کا جسم شب بیداری سے ٹوٹ رہا تھا۔ معاً کسی نے آکر کہا۔ اری نیتی رات بھوندو پکڑا گیا۔"

نیتی تھانے پر پہنچی تو پسینہ میں بھیگی ہوئی تھی اور دم پھول رہا تھا اسے بھوندو پر رحم نہ آیا بلکہ اس پر غصہ آنے لگا۔ سارا زمانہ یہی کام کرتا ہے اور چین کی بنسی بجاتا ہے۔ انہوں نے کہنے سننے پر ہاتھ لگایا اور ایک کام کئے تو چوک گئے اور پکڑے گئے اسے دیکھتے ہی تھانیدار نے دھونس جمائی یہی تو ہے بھوندو کی عورت اسے بھی پکڑ لو۔"

نیتی نے اکڑ کر کہا۔ ہاں ہاں پکڑ لو یہاں کسی سے نہیں ڈرتے جب ڈرنے کا کام نہیں کرتے تو ڈریں کیوں؟

افسر اور ماتحت سب نیتی کی طرف دیکھنے لگے۔ بھوندو بھی وہاں دھوپ میں کھڑا تھا اس نے نیتی کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا تھا دیکھنا کہیں ان لوگوں کے دھوکے میں نہ آجانا۔ نیتی نے شوہر کی بے بسی کو دیکھا اس کا سینہ پھٹا جاتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ کنجڑوں میں چوری کر کے اقبال کر لینا انتہا درجہ کی ذلت ہے۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو، خدا جانے کتنی سزا ہو جائے وہ جان پر کھیل کر بولی۔ دارو گاجی! تم سمجھتے ہو گے۔ ان غریبوں کی پیٹھ پر

کوئی نہیں ہے۔ لیکن بھگوان تو سب کچھ دیکھتے ہیں، بھلا چاہو تو ان کو چھوڑ دو

کہیں قید ہو گئے تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔

تھانیدار نے مسکرا کر کہا۔ تجھے کیا یہ مر جائے گا۔ کسی اور سے بیاہ کر لینا

کیوں نہ اقبال کر کے چھڑا لیتی ایں وعدہ کرتا ہوں، مقدمہ نہ چلاؤں گا

سب مال لوٹا دے۔ گلابی ساڑھی، پان اور خوشبو دار تیل کیلئے تو ہی بیقرار

ہو رہی ہو گی۔ اس پر مقدمہ چل رہا ہے تو عجیب عورت ہے۔

بنٹی نے چند لمحے غور کیا اور پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔ اچھا داروگا جی

میں سب کچھ دیدوں گی۔ ان پر حرف نہ آنے پائے۔

اور جب بھوندو کو یہ بات معلوم ہوئی کہ بنٹی نے اقبال کر لیا ہے

اس کا سر چکر کھانے لگا۔ لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور گرج کر کہا وہ جھوٹ بولتی ہے

داروغہ صاحب مال برآمد کرنے گئے ہیں، تم ابھی تک اپنی ہی گا رہے ہو

تھانیدار نے کہا۔ اپنے باپ دادا کی وضعداری اپنے ہاتھوں خاک

ملتے دیکھکر بھوندو کا سر جھک گیا۔ اس جگر سوز ذلت کے بعد اب اسے

اپنی زندگی نہ دیتی تھی۔ اب اس نے سوچا وہ اپنی برادری میں کسی کو

منہ نہ دکھا سکے گا۔

بنٹی کو اپنے اس اقبال جرم پر کافی افسوس ہوا لیکن شوہر کو بچانے

کی خاطر وہ ایسے کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ لیکن بھوندو سے اس کو ڈر ہو رہا

تھا کہ وہ اس کے اس اقبال پر ناراض ہو جائے گا۔ تبھی ایک کانسٹیبل

نے آکر کہا۔ اری بنٹی کہاں ہے۔ چل دیکھ بھوندو کا حال برا ہو رہا ہے ابھی

تک تو چپ چاپ بیٹھا تھا۔ پھر نہ جانے کیا جی میں آیا کہ ایک پتھر پر سر

پٹک دیا۔ سر سے لہو بہہ رہا ہے ہم لوگ دوڑ کر پکڑ نہ لیتے تو جان ہی دے

دی تھی۔"

ایک ہفتہ گذر گیا۔ بھوندو رہا ہو چکا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ اور وہ ایک کھٹولی پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور جسم مرجھا گیا تھا۔ وہ فکرمندانہ انداز سے باہر دیکھتا ہے۔۔۔۔۔۔ چاہتا ہے اٹھ کر باہر جاؤں مگر اٹھا نہیں جاتا۔ تھوڑی دیر بعد بارش ہونے لگی اور بنٹی سر پر گھاس کی ایک گٹھری لئے پانی میں تر ابور آتی دکھائی دی۔

بھوندو آہستہ آہستہ کہا۔ تو اتنی بھیگ رہی ہے اگھیں بیمار پڑ گئی تو کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہ رہے گا۔ کہتا ہوں تو اتنا کیوں مرتی ہے دو گٹھے تو بیچ چکی تھی۔ اب یہ تیسرا گٹھا لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہانڈی میں کیا لائی ہے۔

بنٹی نے ہانڈی کو چھپاتے ہوئے کہا کچھ بھی تو نہیں ہے۔ کیسی ہانڈی بھوندو نے زور لگا کر کھٹولی سے اٹھا اور ہانڈی کو دیکھا اس میں گھی تھا۔ بنٹی نے ساڑھی نچوڑتے ہوئے کہا گھی دودھ نہ ملے گا تو کیسے اٹھو گے ہمیشہ چارپائی پر ہی پڑے رہنے کا ارادہ ہے۔

بھوندو نے کھٹولی پر لیٹتے ہوئے کہا۔ اپنے لئے تو ایک ساڑھی بھی نہیں لائی۔ میرے لئے گھی اور دودھ سب چاہیئے میں گھی نہ کھاؤں گا

بنٹی نے مسکرا کر کہا۔ اسی لئے تو گھی کھلاتی ہوں کہ تم جلدی سے کام دھندا کرنے لگو اور میرے لئے ساڑھی لاؤ۔

بھوندو بولا۔ تو آج کہیں چوری کرنے جاؤں کیوں۔ بنٹی نے بھوندو کے گال پر آہستہ سے چپت لگا کر کہا، "پہلے میرا گلا کاٹ دینا پھر جانا!"

وفا کی دیوی

سانگلی کے کنور صاحب اور ان کی رانی گنگا کے کنارے اشنان کرنے آتے ہیں۔ ماگھ کا مہینہ ہے صبح کا وقت ہے۔ جا بجا سادھو۔ سنتوں اور بھجن گانے والوں کی ٹولیاں بیٹھی ہوئی ہیں کنور صاحب اور ان کی رانی اپنی چھ سالہ لڑکی کو لئے ہوئے ہیں۔ ان کے ساتھ کئی سپاہی پیادے وردیاں پہنے چلے آرہے ہیں۔ کئی خدمتگار بھی ہیں یہ لوگ ہجوم ہٹاتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچکر اشنان کرتے ہیں۔ لڑکی پانی سے کھیل رہی ہے۔ راجہ صاحب پنڈتوں کو دان دے رہے ہیں اور لڑکی اپنی کشتی پانی میں تیرا رہی ہے یکایک اس کی کشتی ایک ریلے میں بہہ جاتی ہے۔ لڑکی اسے پکڑنے کے لئے لپکتی ہے۔ اسی وقت آدمیوں کا ایسا ریلا آتا ہے کہ لڑکی ماں باپ سے الگ ہو جاتی ہے۔ اور یہ چھوٹی لڑکی ہجوم میں اپنے ماں باپ سے بچھڑ جاتی ہے۔ کنور صاحب اور رانی اپنی کھوئی ہوئی لڑکی کو تلاش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ بالآخر وہ اپنی تلاش میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

کنور صاحب کی کھوئی ہوئی لڑکی ایک سادھو کو ملتی ہے اور سادھو کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ لڑکی کو گود میں لئے سوچ رہے ہیں کہ جب اس کے والدین کا پتہ ہی نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں انکا نفس لڑکی کو چھپائے رکھنے کی تحریک کرتا ہے۔ وہ راجکماری کو لئے اپنی کٹیا کی طرف چلے جاتے ہیں۔

ایک کوہستانی مقام میں ایک صاف ستھری بیلوں اور پھولوں سے آراستہ کٹی ہے۔ وہی مہاتما کٹیا کے سامنے ایک چٹان پر بیٹھے طنبورے

یہ گا رہے ہیں۔ راجکماری بھی ان کے سُر میں سُر ملا کر گا رہی ہے اس کی عمر اب دس سال کی ہوگی بھجن گا چکنے کے بعد لڑکی پھول چننے لگتی ہے اور ایک مالا بناتی ہے۔ پھر کٹیا میں جاکر ٹھاکر جی کو اشنان کراتی ہے سادھو بھی آجاتے ہیں۔ اور دونوں ٹھاکر جی کی اُستت کرتے ہیں

پھر وہ وجد میں آکر ناچنے لگتے ہیں۔ ذرا دیر بعد لڑکی بھی رقص کرنے لگتی ہے۔ کیرتن ختم ہو جانے کے بعد دونوں چرنامرت لیتے ہیں اور سادھو راجکماری کو جس کا نام اندرا رکھا گیا ہے۔ پڑھانے لگتے ہیں۔

انہیں اس کو گانا بجانا ناچنا سکھاتے اور پڑھانے میں روحانی لطف حاصل ہوتا ہے۔ ان کی دلی آرزو ہے کہ اندرا، ایشور بھجن اور دنیا کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کرے وہ اس مبارک دن کا خواب دیکھتے ہیں۔ جب اندرا ٹھاکر جی کے سامنے میرا کی طرح گائے گی اور وجد میں آکر ناچے گی اندرا اتنی حسین اتنی خوش گلو اور رقص کرنے میں اتنی مشتاق ہے کہ جب رات کو وہ کیرتن کرنے لگتی ہے تو بھگتوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔

مہاتما جی نے یہ پانچ سال اسی کٹیا میں کاٹے، اب اندرا سفر کی تکلیفیں برداشت کرنے کے قابل ہو گئی ہے اس لیے اب سادھو تیرتھ یاترا کرنے نکلتے ہیں مہاتما جی برسوں تک تیرتھ استھانوں کی یاترا کرتے رہتے ہیں۔ کبھی بدری ناتھ جاتے ہیں۔ کبھی کیدار ناتھ، کبھی دوارکا، کبھی کاشی اور کبھی پوری۔ ہر ایک جگہ مندر میں دونوں کیرتن کرتے ہیں اور عقیدتمندوں کو معرفت کے نشہ سے متوالا کرتے ہیں۔ اب مہاتما جی اندرا کو شاستر اور وید کی بھی تلقین کرتے ہیں۔

ایک دن مہاتما جی اور اندرا دونوں ایک گاؤں میں جاتے ہیں۔

اس گاؤں میں ایک ہفتہ سے طاعون پھیلا ہوا ہے۔ گاؤں کے باہر لوگ جھونپڑیاں ڈالے پڑے ہیں۔ مہاتماجی ایک درخت کے نیچے آسن جماتے ہیں اور طاعون زدوں کا معالجہ کرتے ہیں۔ اندرا بھی عورتوں کی خدمت میں معروف ہو جاتی ہے جڑی بوٹیاں تلاش کرنا دوائیں بنانا مریضوں کو اٹھانا بٹھانا، ان کے بچوں کیلئے کھانے پینے کی فکر کرنا ان دونوں کا روزمرہ کا کام ہے۔ یہاں تک کہ مہاتماجی کو طاعون ہو جاتا ہے اور ایک دن وہ اندرا کو الشور بھجن اور لوگوں کی خدمت کا اپدیش کر کے ٹھاکر جی کے چرنوں کا دھیان کرتے ہوئے سمادھی لے لیتے ہیں گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے۔ مہاتماجی کی ارتھی دھوم دھام باجے گاجے کے ساتھ نکلتی ہے گاؤں کا چکر لگانے کے بعد اسی درخت کے سایہ میں ان کی چھتری بنتی ہے جہاں وہ آسن جمائے بیٹھے تھے۔

اندرا کی عمر اس وقت بیس اکیس سال کی ہے اس کے چہرے پر ایسا جلال تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھک جاتی تھیں اس کا مضبوط جسم ہر ایک قسم کی سختیاں جھیلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ اسی گاؤں میں رہے۔ لیکن وہ اس گاؤں میں نہیں رہنا چاہتی تھی کیونکہ جس گاؤں میں اس پر یہ مصیبت پڑے اور جس کا محسن ہمیشہ کیلئے اس سے جدا ہو جائے وہ اب نہیں رہ سکتی تھی۔ آخر ایک دن وہ سب سے رخصت ہو کر نکل پڑی وہ گاؤں گاؤں اور شہر شہر الشور کے بھجن سناتی اور عوام کے دلوں میں بھگتی اور سیوا کی شمع جلاتی پھرتی تھی۔ وہ جس شہر میں جا پہنچتی، تھوڑی ہی دیر میں ہزاروں آدمی جمع ہو جاتے اس کی سواری کے لیے بہترین نعمتیں پیش کی جاتیں۔ مگر وہ نمائش اور تکلف کو حقیر سمجھتی

ہوئی کسی مندر کے سامنے درخت کے سایہ میں ٹھہرتی ہے۔ اندرا کو صوفی شعرا کا کلام بہت پسند تھا۔ میرا بائی، کبیر داس وغیرہ کے دوہوں کو بڑے شوق سے پڑھتی ہے اور انہیں کے بھجن گاتی ہے۔ تلسی اور سورداس کے پدوں سے بھی اسے عشق ہے حالیہ شعرا میں اسے جس کا کلام سب سے زیادہ عزیز ہے وہ ہری ہر نام کا ایک شاعر ہے وہ اس کے گیتوں کو پڑھکر متوالی ہو جاتی ہے اس کے لئے اس کے دل میں خاص احترام ہے وہ چاہتی ہے کہ کہیں ہری ہر سے ملاقات ہو جاتی تو وہ اس کے قدموں کو بوسہ دیتی۔

کئی سال ہوئے ہری ہر ایک متمول رئیس تھا۔ شعر و سخن کا دلدادہ تھا فلسفیانہ خیالات میں ڈوبا ہوا۔ تصوف میں رنگا ہوا۔ اپنے عالیشان محل کو چھوڑ کر ایک جھونپڑی میں بیٹھا تصوف اور فلسفہ کے جذبات کو شعر اور نغمہ کے دلفریب رنگ میں ادا کیا کرتا تھا اور اس کو دنیاوی جاہ و حشم اور مال و دولت سے نفرت تھی اس لئے اس کی اس بیزاری اور لاپرواہی سے آہستہ آہستہ اس کی تمام دولت لٹ گئی دوسروں نے غاصبانہ قبضہ کر لیا لیکن وہ اپنی اسی شاعری کی دھن میں مگن تھا۔ وہ گاؤں کے باہر کسی درخت کے سایہ میں مقیم ہوتا اور جنگلی پھل کھاکر سو رہتا اور اس کو یہی گوشہ عافیت معلوم ہوتا ہے، ملکیت کی فکر سے آزاد ہو کر وہ مطمئن تھا۔

شام ہو گئی ہے۔ شہر کے چوک میں اندرا اپنے طنبورے پر ایک پد گا رہی تھی۔ ہزاروں آدمیوں کا ہجوم تھا۔ ہری ہر بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ اندرا اسی کا پد گا رہی تھی۔ اس کی ایک ایک تان اس کے دل پر چوٹ کرتی ہے۔ ہری ہر کو آج اپنے کلام کی گہرائی درد اور تاثر کا اندازہ ہوا۔ اندرا اپنا گانا ختم کر دیتی ہے اور جانے لگتی ہے اس کے پیچھے۔

عقیدتمندوں کا ایک اژدھام تھا۔ کٹیا کے قریب پہنچکر اندرا سب آدمیوں کو رخصت کر دیتی ہے۔ صرف ہری ہر اس کے کچھ فاصلے پر چلا آرہا تھا۔

اندرا اپنی کٹیا میں پہنچکر پانی بھر لاتی ہے اور تب ٹھاکر جی کا بھوگ لگاکر خود کھاتی ہے پھر زمین پر پڑ رہتی ہے۔

سفید چاندنی چٹکی ہوئی ہے۔ ہری ہر کٹیا کے سامنے زمین پر بیٹھکر پتھر کے ٹکڑوں پر کوئلے سے تازہ عشق و محبت کا گیت لکھنے لگتا ہے۔ ساری رات لکھتے گذر جاتی ہے اور جب طلوع سحر کی سُرخی نمودار ہوتی ہے تو وہ ان پتھر کے ٹکڑوں کو اندرا کی کٹیا کے دروازے پر ترتیب سے رکھ کر وہاں سے کچھ دور ایک درخت کے نیچے جاکر لیٹ جاتا ہے۔

صبح جب اندرا بیدار ہوتی ہے تو عین دروازے پر اسے سنگریزے ترتیب سے رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ حیرت میں آکر ایک پتھر اٹھا لیتی ہے اس پر اسے پریم کا نغمہ تحریر کیا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ دوسرا پتھر اٹھاتی ہے۔ اس پر بھی وہی تحریر ہے اور وہ اس گیت کا دوسرا بند معلوم ہوتا ہے۔ پھر تو وہ سارے سنگریزوں کو اٹھا کر پڑھتی ہے۔ یہ اسی زندہ جاوید ہری ہر کا کلام ہے۔ اس کے دل و دماغ میں یہ خیال کوند سا گیا اور وہ چاروں طرف اسے تلاش کرنے لگی۔ آخر کار وہ ایک درخت کے سایہ میں نظر آتا ہے، اندرا اسے پرنام کرتی ہے۔

اب ہری ہر بھی وہیں رہتا ہے۔ وہ کٹیا کے اندر رہتی ہے۔ ہری ہر باہر رہتا ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ پہاڑیوں کی سیریں کرتے، جنگلی پھل کھاتے پہاڑیاں اندرا کے نغموں سے گونج جاتیں۔ دونوں ساتھ ساتھ ٹھاکر جی کے بڑے مندر میں کیرتن کرنے جاتے ہیں۔ وہ اب شہر میں اپنا راگ سنانے

نہیں آتی تھی۔ اب اس کا سننے والا صرف ہری ہر ہے۔ مگر شہر کے عقیدتمندوں کی اب بھی بھیڑ لگ جاتی تھی۔

ایک روز جب کہ صبح کا سہانا سماں تھا۔ اندرا جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھی ہوئی گا رہی تھی اور ہری ہر سامنے بیٹھا ہوا ٹھاکر جی کیلئے ایک ہار گوندھ رہا تھا۔ یکایک راجکمار گیان سنگھ گھوڑے پر سوار ادھر سے گذرتا ہے اس کے ساتھ کچھ شکاری اور مصاحب ہیں اندرا کا نغمہ سنتے ہی ایسے جیسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔ اس کا گھوڑا وہیں رک جاتا ہے۔ راجکمار گھوڑے سے اتر پڑتا ہے۔ جب گانا ختم ہو جاتا ہے تو وہ اندرا کے قریب آکر ادب سے پرنام کرتا ہوا اس کا نام دریافت کرتا ہے۔ وہ اب تک بن بیاہ تھا وہ ادب کے ساتھ اندرا کو محل میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اندرا ایک دن کی مہلت مانگتی ہے۔ گیان سنگھ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے۔

اندرا یہ دعوت پاکر خوشی سے پھولی نہیں سماتی وہ سوچتی ہے۔ شاہی عنایات کی بدولت وہ زندگی کے تفکرات سے آزاد ہو جائے گی اور ہری ہر کے ساتھ گوشہ قناعت میں بیٹھی ہوئی زندگی کے دن کاٹ دے گی ہری ہر خیال کرتا کہ اندرا تو اس میں کتنی خوش ہوگی۔ کیونکہ راجکمار کے دل کی کیفیت اس سے مخفی نہیں تھی۔ کیا ایسی بے مثال حسینہ جنگل وبیابان میں پھرنے کے قابل ہے۔ اسے ایشور نے کسی محل کی زینت بننے کیلئے ہی بنایا ہے۔ ہری ہر کے ساتھ رہ کر اسے فقر اور فاقہ کے سوا اور کیا نصیب ہوگا۔ وہ اس دیوی کو آزمائشوں میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کی روحانی تسکین کے لئے اتنا ہی یقین کافی تھا کہ اندرا کے دل میں اس کی جگہ ہے یہی

خیال اس کی زندگی کو معراج کمال تک پہنچانے کیلئے کافی تھا۔ اس کے دل میں اور کوئی خواہش کوئی آرزو نہیں تھی۔

دوسرے دن اندرا گیان سنگھ کے ہمراہ شاہی محل میں پہنچ جاتی ہے۔ سب اندرا کا کیرتن سن کر بے خود ہو جاتے ہیں۔ راج ماتا اندرا کو گلے لگالیتی ہے اور اپنی موتیوں کی مالا نکال کر اس کی گردن میں ڈال دیتی ہیں اسی وقت پدما آتی ہے۔ پدما کا باپ سردار کیسری سنگھ راج میں وزارت کے عہدہ پر مامور تھا۔ وہ پدما کی شادی راجکمار گیان سنگھ سے کرنا چاہتا ہے پدما بھی راجکمار کو سچے دل سے چاہتی ہے۔ مگر راجکمار اس کی طرف زیادہ مائل نہیں تھا۔ پدما جب آکر یہاں دیکھتی ہے کہ اندرا کی قدر و منزلت ہو رہی ہے تو اس کے دل میں حسد و رقابت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اسے ذلیل کرنے کے منصوبے باندھنے لگتی ہے۔ لیکن اس کے منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں۔

ایک دن محل میں محفل آراستہ ہوتی ہے۔ مہاراجہ جودل اور سانگلی کے کنور صاحب بھی اتفاق سے تشریف لاتے ہیں۔ کنور صاحب چودہ پندرہ برسوں میں بڑے بڑے صدمے برداشت کئے تھے۔ ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا اور بیوی اور گمشدہ بیٹی کی یاد میں بہت لاغر اور کمزور ہو گئے تھے۔ جب اندرا محویت کے عالم میں گا رہی تھی تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انہیں اندرا کی صورت میں اپنی بیوی کا عکس نظر آیا۔ اور جب گانا ختم ہوا تو وہ اندرا کے قریب گئے اور موقع پا کر اس کا نام اور ماں باپ کا حال پوچھے۔ اندرا اپنے بچپن کا واقعہ ان سے بیان کرتی ہے۔ کنور صاحب کو یقین ہو جاتا ہے کہ اندرا ان کی کھوئی ہوئی لڑکی ہے۔ ان کے دل میں بے اختیار ولولہ اٹھتا ہے کہ اسے گلے سے لگالیں مگر شرم مانع ہو جاتی ہے کیا خبر

وہ انکار کر دے تو۔ اور اندرا بھی کنور صاحب کے چہرے میں اپنے باپ کی شفقت کے آثار دیکھتی ہے۔ لیکن وہ بھی اس اظہار سے مجبور تھی کہ کہیں کنور صاحب انکار کر دیا تو خفت ہوگی۔

دن گذرتے جاتے ہیں اور پھر ایک روز گیان سنگھ اندرا سے اپنی محبت کا اظہار کر دیتے ہیں اور اندرا ان کو جواب دیتی ہے۔ محبت جو منتر سے پیدا ہونے والی چیز نہیں ہے۔ جو محبت ایک نگاہ سے پیدا ہو سکتی ہے، وہ ایک نگاہ میں فنا بھی ہو سکتی ہے۔ آپ راجکمار ہو، مجھے کیا بھروسہ ہے کہ مجھ سے زیادہ حسینہ اور جمیلہ عورت پاکر آپ میری طرف سے آنکھیں پھیر لوگے۔ پھر تو میں کہیں کی بھی نہ رہوں گی"

راجکمار! ہاں تمہاری یہ شرط مجھے منظور ہے۔ مجھے موقع دو کہ میں اپنی محبت کا نقش تمہارے دل پر جما سکوں لیکن اگر تم مجھ سے منہ موڑ کر چلی گئیں تو دیکھو لینا اسی دن تمہیں میرے مرنے کی خبر ملے گی۔

اندرا رفتہ رفتہ راج کے تمام معاملات میں دخل اندازی کرتی ہے راج سدھار کا کام اپنے ہاتھ میں لیکر راجکمار کے دل میں اعتماد حاصل کرتی ہے غیر ضروری ملازمین کی تخفیف اور نئے انتظامات کا مشورہ دیتی ہے جس سے راج میں خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ لیکن ان تمام باتوں سے بدنما ناواقف تھی اور وہ امراء اور ملازموں میں بدگمانیاں پیدا کرنے لگیں۔

ایک روز گیان سنگھ اور اندرا شاہی محل کے ایک کمرہ میں شطرنج کھیل رہے تھے۔ اور یہ بازی اس شرط پر کھیلی جارہی تھی کہ اگر وہ جیت جائے گی تو راجہ سے جو چیز چاہے گی۔ طلب کرے گی۔ راجہ کو اس کی تعمیل میں انکار نہ ہوگا۔ راجہ کو بھی یہی اختیار ہوگا۔ بازی کھیلی گئی اس میں بار راجکمار

کو ہوگی۔ اندرا اسی وقت ایک فرمان نکالتی ہے اور راجہ سے اس پر دستخط کرنے کی درخواست کرتی ہے۔ راجہ اس فرمان کو دیکھتا ہے جس میں غلہ کا محصول درآمد معاف کر دیا گیا تھا۔ ریاست میں غلہ زیادہ تر دیگر ملکوں سے آتا ہے اس پر درآمد محصول کے باعث غلہ گراں ہو جاتا تھا اور رعایا کو تکلیف ہوتی تھی۔ اندرا غریبوں کو سستا غلہ پہنچانے کی فکر میں تھی اور آج موقع پاکر اس نے یہ فرمان پیش کیا۔ چونکہ گیان سنگھ بازی ہار چکا تھا۔ فرمان پر دستخط کر دیا۔

اسی وقت باہر ایک شور برپا ہوتا ہے۔ ایک سنتری دوڑا ہوا آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ باغیوں نے شاہی محل کو گھیر لیا ہے اور اندر گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گیان سنگھ کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو جاتا ہے اور فصیل کے اوپر چڑھ کر شورش کرنے والوں کو مخاطب کر کے اس شورش کا سبب پوچھتا ہے ایک آدمی نیچے سے جواب دیتا ہے۔ ہم یہ مظالم نہیں برداشت کر سکتے اندرا ہماری تباہی کا باعث ہے وہ ہماری رانی نہیں بن سکتی۔

گیان سنگھ، اندرا کے احسانات جو اس نے قوم پر کئے ہیں بیان کرتا ہے مگر نیچے سے وہی جواب آتا ہے۔

پدما جو اس سازش کی کرتا دھرتا تھی اندرا سے آکر کہتی ہے کہ بھاگ جاؤ ورنہ تمہاری جان خطرہ میں ہے اور پدما اس کو ایک چور دروازے سے بھگا دیتی ہے یہاں پر پہلے ہی سے ہری ہر کو بلوا لیا گیا تھا ہری ہر ایک گھوڑے پر اندرا کو سوار کراتا ہے۔ دوسرے پر خود بیٹھتا ہے اور دونوں شہر کی اندھیری سڑکوں پر ہوتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور پھر پدما فصیل پر آکر باغیوں سے کہتی ہے۔ بہادرو! میں تمہیں خوشخبری سناتی ہوں کہ اندرا

اب اس محل میں نہیں ہے۔ باغی سپاہی اس خبر کو سنکر واپس ہو جاتے ہیں راجکمار گیان سنگھ کو اندرا کی اس حرکت پر غصہ آگیا اور وہ اندرا کی بیوفائی پر تعجب کرنے لگا۔ اور پدما نے اندرا کے خلاف راجکمار کے کان اور بھرنا شروع کر دیئے راجکمار کا دل پدما کی طرف سے نرم پڑ جاتا ہے، وہ اسے ضبط اور وفا کی دیوی خیال کرنے لگتا ہے۔ پدما اگر آڑے نہ آتی تو باغیوں نے محل پر قبضہ کر لیا ہوتا۔ اس مایوسی اور غم کی حالت میں پدما ہی اسے نجات کی دیوی نظر آتی ہے۔

اندرا اور ہری ہر کئی دنوں کے بعد سانگلی کی ریاست میں پہنچتے ہیں۔ یہیں دونوں ایک گاؤں میں رہنے لگتے ہیں۔ دونوں گاؤں والوں کی خدمت کرتے ہیں اور ان کی خدمت سے گاؤں والے خوش ہیں۔ دونوں رات کو کیرتن کرتے ان کی خدمت اور بھگتی کا شہرہ دوسرے قریب کے گاؤں میں پھیل جاتا ہے اور عقیدت مندوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔

ایک دن سانگلی کے کنور صاحب شکار کھیلنے آتے ہیں اور اندرا کو دیکھ پاتے ہیں۔ ان سے ضبط نہیں ہوتا اور اندرا کو گلے لگا کر کہتے ہیں تو میری کھوئی ہوئی پیاری بیٹی ہے۔ وہ اسے اپنے ساتھ چلنے کے لئے اصرار کرتے ہیں۔ لیکن اندرا ہری ہر کی محبت میں جاہ وحشم شان وشوکت دولت وثروت سب کچھ نثار کر دیتی ہے اور وہ ان کو ٹھکرا دیتی ہے۔

گیان سنگھ کے مخبر اور جاسوس چاروں طرف چھوٹے ہوئے تھے ایک دن اسے خبر ملی کہ اندرا سانگلی کے ایک موضع میں ہے۔ گیان سنگھ کو اندرا سے دلی لگاؤ اور محبت تھی وہ دن رات اس کی جدائی سے بے چین رہتا یہ خبر پاتے ہی وہ فوراً اپنے محل سے نکلا۔ پدما بھی اس کے ساتھ تھی۔ پہلے تو

وہ راجہ کو روکتی رہی لیکن جب وہ اس کی بات نہ مانا تو خود بھی راجہ کے ہمراہ ہو گئی۔

گیان سنگھ جب موضع میں پہنچا تو یہ خبر تیزی سے پھیل گئی کہ راجہ گیان سنگھ اندرا اور ہری ہر کو گرفتار کرتے آئے ہیں۔ قرب و جوار کے دہقانی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ اندرا اور ہری ہر پرماتما کا دھیان کر رہے تھے۔ راجہ گیان سنگھ تلوار کھینچکر ہری ہر پر جھپٹا کہ پدما درمیان میں آ گئی اور لپک کر راجہ کے ہاتھ سے تلوار چھین لی۔

راجہ گیان سنگھ دونوں محبت کے شیدائیوں کی یہ جانبازی اور بے نفسی دیکھکر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے دل میں دفعتاً اس روشنی کا ظہور ہوتا ہے جس کے سامنے کمزوریاں اور نفس کی سرکشیاں مٹ جاتی ہیں۔ پھر اندرا کے قدموں پر گر جاتے ہیں۔ گیان سنگھ پھر اٹھکر پدما کو گلے لگا لیتے ہیں۔ کیونکہ اس نے ایک ایسے فعل سے باز رکھا جو راجہ صاحب کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیتا۔

پھر ہری ہر اور گیان سنگھ بغلگیر ہو جاتے ہیں۔

ڈیمانسٹریشن

مہاشے گورو پرشاد نہایت رنگین مزاج شخص تھے۔ گانے بجانے کے شوقین اور سیر و سیاحت سے ان کو حد سے زیادہ دلچسپی تھی۔ شریف آدمیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن کوئی کاروبار مستقل طور پر نہیں تھا۔ بنک سے ششماہی سود آجاتا تھا۔ اور اسی پر گزارہ ہو جاتا تھا۔ ایک دن کسی دوست نے مشورہ دیا کہ ایک ناٹک کمپنی کھولو، بات معقول تھی سمجھ میں آگئی دوستوں اور ملاقاتیوں کو لکھا ڈراماٹیک کمپنی کھولنے کا ارادہ ہے۔ آپ لوگ ڈرامے لکھنے شروع کیجئے۔ کمپنی کے قواعد و ضوابطہ مرتب ہوئے بڑے بڑے آدمیوں نے شیئرز (حصے) خریدنے کے وعدے کئے لیکن بعد میں سب انجان ہو گئے اور مہاشے گورو پرشاد کا خیال، خواب بن کر رہ گیا لیکن وہ اسی دھن میں ایک ناٹک تصنیف کر ڈالے اور اسے ایک کمپنی میں فروخت کرنے کا ارادہ کئے۔ چنانچہ پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی اس میں تمام پروگرام پر تبادلۂ خیالات ہوا اور دوسرے دن گورو پرشاد جی معہ اپنے دوستوں کے ایک کمپنی کو اپنا ناٹک دکھانے چلے۔ تانگے آگئے۔ ہارمونیم طبلہ وغیرہ سب ان پر لاد دیئے گئے۔ کیونکہ ناٹک کے ڈیمانسٹریشن کا فیصلہ ہوا تھا۔ یکایک وتو دیہاری نے کہا۔ یار تانگے پر جانے پر کچھ بے رعبی سی ہوگی۔ مالک خیال کرے گا۔ یہ مہاشے تو یوں ہی ہیں اس لئے کہیں سے دو موٹریں منگانی چاہئیں "

رسک لال نے کہا لیکن کرایہ کی موٹروں سے یہ بات پیدا نہ ہوگی کسی رئیس سے دو موٹریں مانگ لینی چاہئیں "

بات سمجھی تھی۔ بھیس سے بھیک ملتی ہے۔ مختلف قیاس آرائیاں ہونے لگیں لیکن کوئی بھی رئیس ان کی نظروں میں جچتا نہیں تھا۔ آخر کار یہ طے پایا کہ سب لوگ پیدل چلیں تمام راستہ اسی ایک موضوع پر بحث اور گفتگو ہوتی رہی کہ ڈرامانسٹ صاحب کو کس طرح خوش کیا جائے آخر یہ لوگ کمپنی کے دفتر پر پہنچے۔ تقریباً دو بجے کا وقت تھا۔ پروپرائٹر صاحب اپنے ایکٹر اور ڈرامانسٹ کے ساتھ پہلے ہی سے انتظار میں تھے اوپر جاتے ہی رسک لال نے مالک سے کہا معاف فرمایئے ہم لوگوں کو یہاں پہنچنے میں کسی قدر دیر ہوئی موٹر سے نہیں بلکہ پا پیادہ آئے ہیں۔ سب لوگوں کی یہی صلاح ہوئی کہ آج قدرتی مناظر کا لطف اٹھاتے ہوئے چلیں۔ گرو پرشاد جی تو قدرت کے پرستاروں میں سے ہیں۔"

اس کے بعد گرو پرشاد کے تصنیف کردہ ڈرامے کے تعلق سے ان کے دوستوں نے تعریف کے پُل باندھنا شروع کئے۔ ایک نے کہا اس ڈرامے کا مواد فراہم کرنے میں گرو پرشاد نے کم از کم ایک ہزار کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔

ونود نے اپنی زبان کھولی۔ میں اور یہ دونوں کلکتہ گئے تھے اور وہاں متواتر چھ ماہ تک مٹیا برج کی خاک چھانتے رہے۔ واجد علی شاہ کا قلمی مسودہ تلاش کیا۔ اس ڈرامہ کی تکمیل کیلئے اسی کتاب کی بہت شدید ضرورت تھی۔ اس میں انھوں نے خود ہی اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں ایک بڑھیا کو بہت کچھ نذر کرتے پر جھونپڑے میں جاکر کتاب ملی۔

امرناتھ نے یوں تعریف کرنا شروع کیا۔ لاہور ڈرامیٹک کلب کا مالک ہفتہ بھر یہاں پڑا رہا۔ اس کا اصرار تھا کہ یہ ڈرامہ مجھے دے دیجئے

لیکن آپ نے نہ دیا۔

آخر میں گورو پرشاد جی نے اپنے تعلق سے کہنا شروع کیا کہ ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں۔ خون جگر پینا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں ایک ناٹک لکھنے کیلئے پانچ سال کا وقت بھی کافی نہیں بلکہ اچھا ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جاتا ہے۔ روس، فرانس، جرمن تمام زبانوں کے ڈرامے پڑھے مگر کوئی نہ کوئی نقص ہر ایک میں موجود ہے۔ کسی میں جذبات ہیں تو زبان نہیں۔ زبان ہے تو جذبات نہیں۔ مذاق ہے تو گانا نہیں۔ گانا ہے تو مذاق نہیں۔ جب تک جذبات، زبان، مذاق اور گانا یہ چاروں باتیں پورے طور پر موجود نہ ہوں تو اسے ڈرامہ کہنا ہی غلطی ہے۔ میں تو نہایت ہی ناقابل شخص ہوں۔ آپ لوگوں کی صحبت میں کچھ شُد بُد کر لیتا ہوں۔ میری تصنیف کی حقیقت ہی کیا ہے لیکن اگر پرماتما نے چاہا تو اس ڈرامے میں ایسے نقائص آپ کو نہ ملیں گے۔

آخر کار ڈرامہ کا ریہرسل شروع ہوا اور واہ واہ اور ہائے ہائے کا تار بندھ گیا۔ چاروں طرف سے تعریف وتحسین کے نعرے بلند ہونے لگے۔ کمپنی کے تمام ملازمین نے ڈرامہ کی ریہرسل دیکھ کر خوب داد دی اور جب ڈرامہ کا ریہرسل ختم ہو گیا تو چراغ روشن ہوئے

سیٹھ صاحب اب تک خاموش بیٹھے ہوئے تھے نہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور نہ زبان پر تعریف کے جملے۔ آخر دتو بہاری نے معاملے کی بات پوچھی کہ اس ڈرامہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔ سیٹھ جی نے ایک بے نیازانہ انداز میں جواب دیا۔ اس کے متعلق کل عرض کروں گا کل یہیں کھانا بھی کھائیے گا۔

جیسے ہی پانچوں باہر نکلے۔ خوشی کے مارے سب کی باچھیں کھل جاتی تھیں۔ ونود نے کہا، پانچ ہزار کی تھیلی ہے، امرناتھ نے کہا پانچ ہزار ہے کہ دس ہزار، یہ تو نہیں کہہ سکتا، لیکن رنگ خوب جما،"

اور اسطرح پانچوں کل کے متعلق مختلف خوش فہمیوں میں مبتلا تمام راستہ گذار دیئے۔

دوسرے دن پانچوں آدمی سیٹھ جی کے پاس جا پہنچے بہت ہی پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میز پر ڈرامہ کے تعلق سے باتیں ہونے لگیں۔ ڈراماٹسٹ نے کہا۔ ایسا ڈرامہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ لکھتا میں بھی ہوں اور لوگ بھی لکھتے ہیں۔ لیکن۔ آپ کی پرواز تک کس کی رسائی ہوسکتی ہے۔ کہیں تو آپ نے شکسپیر کو بھی مات کر دیا ہے۔

سیٹھ جی۔ ہاں جناب جو چیز دل کی امنگ سے لکھی جاتی ہے وہ ایسی ہی اچھوتی اور لاجواب ہوتی ہے۔ شکسپیر نے جو کچھ لکھا وہ روپیہ کے لالچ سے لکھا۔ ہمارے دوسرے ڈرامہ نویس بھی دولت کیلئے ہی لکھتے ہیں ان میں وہ بات کہاں پیدا ہوسکتی ہے۔

گوسائیں جی کی رامائن کیوں زندہ ہے۔ اس لئے کہ وہ بھگتی اور پریم سے متاثر ہوکر لکھی گئی ہے۔ سعدی'' کی گلستاں بوستاں ہومر کی تصنیفات اس لئے مقبول عام ہیں کہ ان لوگوں نے دل کی امنگ سے لکھا ہے۔ جو دولت کے بندے ہوتے ہیں۔ ان میں امنگ نہیں ہوتی وہ صرف دولت کی خاطر ہی اس کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں۔

ڈرامہ نسٹ:۔ آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی سیٹھ جی۔ واقعی ایسی تصنیف کا معاوضہ اور قیمت نہیں ہوسکتی اور وہ فن پارہ

لافیمت ہوتا ہے

سیٹھ جی :- آپ نے سچ کہا۔ ایسی تصنیف کا معاوضہ اگر ہو سکتا ہے تو وہ روح کی تسکین ہے جس کے دیکھنے اور پڑھنے سے روحانی مسرت ہو یہی اس کی صحیح قیمت ہے۔

میز پر گورو پرشاد کے ڈرامے کا مسودہ رکھا ہوا تھا۔ سیٹھ جی نے اس کو اٹھا کر ڈراما ٹسٹ کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ آپ یہ ڈراما لے لیجیے۔ مہاشے جی کے اس شاہکار کی میں کیا قیمت ادا کر سکتا ہوں؟"

گورو پرشاد نے نیم باز نگاہوں سے دوستوں کی طرف دیکھا دعوت ختم ہو چکی تھی۔ سگار آگئے سیٹھ جی اٹھ کھڑے ہوئے یہ محفل کے برخواست ہو جانے کا اشارہ تھا۔ پانچوں دوست بھی اٹھے۔ سیٹھ جی دروازے تک ان پانچوں کو رخصت کرتے آئے۔

سڑک پر آکر پانچوں دوست ایک دوسرے کا منہ تاکتے لگے اور زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ونود نے کہا۔ یہ ہم سب کا ہی گورو گھنٹال نکلا!

برات

آج بابو دیو کی ناتھ اپنی پندرہ سال کی بیاہتا بیوی کو چھوڑ کر نئی شادی کر رہے تھے۔ رشتہ دار اور عزیز جمع تھے۔ دروازہ پہ نوبت بج رہی تھی اور اندر عورتیں بیاہ کے گیت گا رہی تھیں مگر کوئی یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کر رہا تھا کہ آخر اس بے چاری اور بیکس عورت پر یہ عتاب کیوں ہو رہا ہے۔

پندرہ سال پہلے دیو کی ناتھ کی شادی پھول وتی سے ہوئی تھی۔

پھول وتی حسین اور خوبصورت تھی۔ باتمیز اور تعلیم یافتہ تھی۔ دیوکی ناتھ بھی نیک اطوار اور روشن خیال تھے۔ مگر پہلے ہی دن دونوں میں کچھ ایسی بدمزگی پیدا ہو گئی کہ میاں بیوی میں ایک خلیج حائل ہو گئی اور زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ آج دیوکی ناتھ نئی شادی کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے

دونوں میں اختلاف کا سبب یہ تھا کہ دیوکی ناتھ پرانی تہذیب کے قائل تھے اور پھول وتی نئی روشنی کی دلدادہ تھی۔ پرانی تہذیب پردہ چاہتی ہے۔ تحمل اور صبر چاہتی ہے۔ نئی روشنی آزادی چاہتی ہے، اعزاز چاہتی ہے۔ حکومت چاہتی ہے۔ دیوکی ناتھ چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی ان کی ماں کی خدمت کرے۔ بغیر اجازت گھر سے قدم نہ نکالے۔ لمبا سا گھونگھٹ نکال کر چلے پھول وتی کو ان باتوں میں سے ایک بھی پسند نہ تھی۔ دونوں میں میاحثے ہوئے۔ سخت کلامیوں کی نوبت آئی شکر رنجی ہوئی اور آخرکار دیوکی ناتھ نے پھول وتی سے علیحدگی اختیار کر کے دوسرے بیاہ کا ارادہ کیا۔

دوسرے بیاہ کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ دیوکی ناتھ کو دولہا بنایا جا رہا تھا۔ درزی نے آکر جوڑا پہنایا۔ مالی نے آکر سہرا باندھا، چمار نے آکر جوتی پہنائی۔ کچھ چاچی پگڑی سنوارے اور لوا جی نے آکر آنکھوں میں کاجل لگایا۔ ۵۰ سال کی عمر تھی مگر وضع ایسی بنائی جا رہی تھی کہ ابھی نوجوان ہی ہیں۔ چہرہ پر جھریاں پڑ گئیں تھیں۔ دو چار دانت بھی جواب دے چکے تھے اور بالوں میں کچھ کچھ سفیدی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن دل میں جوانی کی امنگیں تھیں۔

پھول وتی کو جوں ہی اس بیاہ کی اطلاع ملی۔ اس نے دل میں طے کر لیا کہ۔

شادی میرے جیتے جی نہیں ہوگی۔ آج اس زندگی کا آخری فیصلہ کردوں گی۔ اور دکھلا دوں گی کہ آج بھی ہندوستان میں ایسی عورتیں ہیں جو اپنی بات کیلئے ہنستے ہنستے جان دے دیتی ہیں وہ عیش و آرام کیلئے زندہ نہیں رہتیں بلکہ اپنے دھرم کو پالنے کے لئے زندگی گذارتی ہیں۔ پھول وتی گھر سے نکلی ایک مصمم ارادہ اور عزم و استقلال کے ساتھ نکلی ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور سسرال چلی۔

برات تیار تھی۔ دولہا پھولوں سے سجی ہوئی موٹر پر بیٹھ چکا تھا۔ باجے بج رہے تھے۔ یہ تماشا دیکھکر پھول وتی کے سینہ پر سانپ سا لوٹ گیا اچانک اس کے دل میں یہ خیال آیا۔ میں اس برات کو روک دونگی چاہے میری جان ہی کیوں نہ جائے اس خیال کے آتے ہی وہ تانگے سے اتر پڑی اور موٹر کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ دیوکی ناتھ اسے دیکھتے ہی جل بھن کر خاک ہوگئے اور بولے تم یہاں کیوں آئیں تمہیں یہاں کس نے بلایا پھول وتی نے جواب دیا۔ تم شادی نہیں کر سکتے"

دیوکی ناتھ:۔۔۔ تم مجھے روک لوگی؟

پھول وتی:۔ یا تو روک لونگی یا اپنی جان دے دوں گی

دیوکی ناتھ:۔ اگر جان دینا چاہتی ہو تو کنوئیں میں کود پڑو یا زہر کھاؤ اس پر صبر نہ آئے تو دوسری شادی کر لو۔ یا کسی کو لیکر نکل جاؤ۔ میں تمہیں نہیں روکتا میرے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ میں نے تمہارے لئے اپنی آدھی زندگی تلخ کردی۔ میرا کہنا مانو، راستہ سے ہٹ جاؤ ورنہ میں موٹر چلا دوں گا۔

پھول وتی:۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں مجھے پیروں تلے روند کر تم جا سکتے ہو

دیوکی ناتھ خود موٹر سے اتر آئے اور بولے سامنے سے ہٹے گی یا نہیں:

ہٹ جا نہیں تو میں کچل دوں گا۔

پھول وتی نے پر عزم ارادہ سے کہا۔ "تمہیں اختیار ہے۔ جو چاہو کرو میاں تم ایک بار کہدیا میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ تحقیر نہیں برداشت کر سکتی۔

دیو کی ناتھ اب ضبط نہ کر سکے۔ ڈرائیور سے بولے "چلا دو موٹر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا"

ڈرائیور نے موٹر چلانے سے انکار کیا۔ وہ ایک عورت پر دیدہ و دانستہ موٹر چلا کر اپنی زندگی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ موٹر سے اتر کر چل دیا پھول وتی پھر سے کہنے لگی "تم مجھے موت سے کیا دھمکاتے ہو! موت سے وہ ڈرے جیسے عیش و آرام کی آرزو ہو۔ یہاں تو مرنے کیلئے تیار ہو کر آئی ہوں۔ دیو کی ناتھ کا غصہ طیش کی حد تک جا پہنچا تھا۔ جب انسان غصہ سے باہر ہو جاتا ہے تو اس کی قوت تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ اتنے آدمیوں کے روبرو ایک عورت کے ہاتھوں وہ خفت زدہ اور شرمندہ نہ ہونا چاہتے تھے۔ سفاکانہ عزم کے ساتھ ہارن بجایا۔ پھول وتی ایک بار چونک پڑی اور فطری طور پر اس کا قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مگر فوراً سنبھل کر پھر موٹر کے سامنے آ گئی اور لیٹ گئی موٹر نے دوبارہ ہارن بجایا اور پھر تیسری بار ہارن بجایا لیکن پھول وتی نے جنبش نہ کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں آخر کار موٹر اس کے جسم پر سے گذر گئی فضاء میں ایک چیخ کی آواز گونجی اور ختم ہو گئی یہ منظر اتنا دردناک، اتنا نفرت انگیز، اتنا وحشیانہ تھا کہ ہزاروں تماشائیوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ صدہا آدمی ایک اندھے جنون کے عالم میں موٹر پر ٹوٹ پڑے۔ دیو کی ناتھ کو موٹر سے نیچے اتارا اور خونخوار

درندوں کی طرح ان پر چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور تھوڑی ہی دیر بعد دونوں کی لاشیں آمنے سامنے پڑی ہوئی تھیں۔

رات میں دونوں جنازے چلے ڈھول اور باجوں کی آواز کی بجائے آہ و بکا کی گرم بازاری تھی۔ یہ نئی برات تھی۔

دُکھی چمار، جھریا۔ پنڈت کا بلاوا آنا

نجات

دُکھی چمار سے اس کی بیوی جھریا نے کہا، تو جاکر پنڈت بابا سے کہہ آؤ ایسا نہ ہو کہ کہیں چلے جائیں۔ دکھی نے یہ سُنکر لکڑی اٹھائی اور گھاس کا ایک بڑا سا گٹھا لے کر پنڈت جی سے عرض کرنے چلا خالی ہاتھ باباجی کی خدمت میں کس طرح جاتا۔ نذرانے کیلئے اس کے پاس گھاس کے سوا اور کیا تھا۔ اسے خالی ہاتھ دیکھکر تو باباجی دور ہی سے دھتکار دیتے تھے پنڈت گھاسی رام ایشور کے پرم بھگت تھے۔ انہوں نے دکھی کو دیکھتے ہی کہا۔ آج کیسے چلا رے دکھیا؟"

دکھی نے سر جھکا کر کہا۔ بٹیا کی سگائی کر رہا ہوں۔ مہاراج ساعت شگن بچارنا ہے۔ کب مرجی رہو گی۔

گھاسی:- آج تو مجھے چھٹی نہیں ہے۔ شام تک آجاؤں گا

دکھی:- نہیں مہاراج! جلدی مرجی ہو جائے۔ سب سامان ٹھیک کر آیا ہوں۔ یہ گھاس کہاں رکھدوں۔

گھاس:- اس گائے کے سامنے ڈالدے اور ذرا جھاڑو لیکر دروازہ تو صاف کر دے، یہ بیٹھک بھی کئی دن سے لیپی نہیں گئی۔ اسے بھی گوبر سے لیپ دے تب تک میں کھو جن کر لوں۔ پھر ذرا آرام کرکے چلونگا ہاں

یہ لکڑی بھی چیر دینا، کھلیان میں چار کھانچی بھوسا پڑا ہے۔ اسے بھی اٹھا لانا اور بھوسیلے میں رکھ دینا۔

دکھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ دروازے پہ جھاڑو لگائی، بیٹھک کو گوبر سے لیپا۔ اس وقت ۱۲ بجے تھے۔ پنڈت جی بھوجن کرنے چلے گئے۔ دکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بھی زور کی بھوک لگی۔ لیکن وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا۔ گھر یہاں سے میل بھر دور تھا۔ وہاں کھانے چلا جائے تو پنڈت جی بگڑ جائیں۔ بیچارے نے بھوک دبائی اور لکڑی پھوڑنے لگا۔ لکڑی کی موٹی سی گرہ تھی اس پہ اس سے پہلے کتنوں ہی نے زور آزمالیا تھا۔ وہ کس کس کر کلہاڑی کا بھرپور ہاتھ جماتا۔ لیکن اس گرہ پہ نشان تک نہیں پڑتا تھا۔ پسینہ سے تر تھا۔ ہانپتا تھا۔ تھک کر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر اٹھتا تھا ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ پاؤں کانپ رہے تھے۔ کمر نہ سیدھی ہوتی تھی۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا۔ سر میں چکر آ رہے تھے۔ پھر بھی اپنا کام کئے ہی جاتا تھا۔ اگر ایک چلم تمباکو پینے کو مل جاتا تو شاید کچھ طاقت آتی۔ اس نے سوچا یہاں چلم تمباکو کہاں ملے گی۔ برہمنوں کا گاؤں ہے۔ برہمن ہم سب نیچ جاتوں کی طرح تمباکو تھوڑا ہی پیتے ہیں۔ یکایک اسے یاد آیا کہ گاؤں میں ایک گونڈ بھی رہتا ہے۔ اس کے پاس ضرور تمباکو چلم ہوگی فوراً اس کے گھر دوڑا اور وہاں سے چلم اور تمباکو لیکر واپس آیا اور پنڈت جی کے گھر میں دالان کے دروازے پہ کھڑا ہو کر بولا۔ مالک ذرا سی آگ مل جائے تو چلم پی لوں۔" پنڈت جی بھوجن کر رہے تھے پنڈتانی نے پوچھا، یہ کون آدمی آگ مانگ رہا ہے

پنڈت جی نے کہا، دکھیا چمار ہے لکڑی پھوڑ رہا ہے۔ اگر کوئی لکڑہارا یہی لکڑی چیرتا تو کم از کم چار آنے لیتا"

پنڈتانی نے بھویں چڑھا کر کہا۔ تمہیں تو جیسے پوتھی پترے کے پھیر میں دھرم کرم کی سدھ بھی نہ رہی۔ چمار ہو، دھوبی ہو، منہ اٹھائے گھر میں چلے آتے ہیں۔ پنڈت کا گھر نہ ہوا کوئی سرائے ہوئی کہہ دو کہ ڈیوڑھی سے چلا جائے ورنہ اسی آگ میں منہ جھلس دونگی۔

پنڈت جی نے انہیں سمجھا کر کہا۔ اندر آ گیا تو کیا ہوا۔ تمہاری کوئی چیز تو نہیں چھوئی۔ زمین پاک ہے۔ ذرا سی آگ کیوں نہیں دیتیں،،

پنڈتانی:۔ اچھا اس وقت تو آگ دیئے دیتی ہوں، لیکن پھر وہ اس گھر میں آئے گا تو منہ جھلس دوں گی۔

دکھی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑی بے چارہ پچھتا رہا تھا کہ ناحق آیا۔ سچ تو کہتی ہیں۔ پنڈت جی کے گھر چمار کیسے چلا آئے یہ لوگ پاک صاف ہوتے ہیں۔

دکھی نے چلم پی کر کلہاڑی سنبھالی، دم لینے سے ذرا ہاتھوں میں طاقت آگئی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک پھر کلہاڑی چلاتا رہا پھر بے دم ہو کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہی گونڈ آ گیا بولا۔ بوڑھے دادا! جان کیوں دیتے ہو تمہارے پھوڑے یہ گانٹھ نہ پھوٹے گی، ناحق ہلکان ہوتے ہو"

دکھی نے پیشانی کا پسینہ صاف کر کے کہا۔ بھائی ابھی گاڑی بھر بھوسہ ڈھونا ہے"

گونڈ:۔ کچھ کھانے کو بھی دیا یا کام ہی کرانا جانتے ہیں، جا کے مانگتے کیوں نہیں

دکھی :- تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو، بھلا بامھن (برہمن) کی رد ٹی ہم کو پچے گی۔

گونڈ :- پچنے کو تو پچ جائے گی۔ مگر یہ دیں تو نا۔ خود کھانا کھایا اور آرام سے سو رہے، تمہارے لئے لکڑی پھوڑنے کا حکم لگا دیا۔ زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ حاکم بھی بیگار لیتا ہے تو تھوڑی بہت مزدوری دیدیتا ہے یہ ان سے بھی بڑھ گئے، اس پر دھرماتما بنے پھرتے ہیں۔

گونڈ چلا گیا اور دکھی سوچنے لگا۔ یہ گانٹھ انہوں نے کہاں سے رکھ چھوڑی ہے۔ کہ پھوٹنے ہی نہیں پاتی اس لئے وہ بھوسہ ڈھونے لگا اور جب یہ کام ختم ہو گیا تو وہ تھک کر چور چور ہو گیا تھا۔ بھوک کی شدت غالب آ چکی تھی۔ تھوڑی دیر آرام کی خاطر بیٹھا ہی تھا کہ آنکھ لگ گئی۔

پنڈت جی بیدار ہوئے اور باہر نکلے تو دیکھا کہ دکھیا سو رہا ہے۔ اور لکڑی جوں کی توں پڑی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس کو اٹھایا اور کہنے لگے منٹھی بھر بھوسہ اٹھانے میں شام کر دی۔ اس پر سو رہا ہے۔ کلہاڑی اٹھالے اور لکڑی پھوڑ ڈال۔ تجھ سے ذرا سی لکڑی بھی نہیں پھوٹی پھر ساعت بھی ویسی ہی نکلے گی۔ مجھے دوش مت دینا۔

دکھی نے پھر کلہاڑی اٹھائی۔ پیٹ میں دھنسا جاتا تھا آج صبح ناشتہ تک نہ کیا تھا۔ دل پر جبر کر کے اٹھا۔ کہیں پنڈت جی ساعت ٹھیک نہ دیں تو پھر ستیاناس ہو جائے گا۔ ساعت ہی تو سب کچھ ہے جیسے چاہیں بنا دیں، جسے چاہے بگاڑ دیں۔

پنڈت جی گانٹھ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور اس کی حوصلہ افزائی

کرنے لگے۔ دکھی اپنے ہوش میں نہ تھا۔ نہ معلوم کونسی غیبی طاقت اس کے ہاتھوں کو چلا رہی تھی۔ تھکان، بھوک پیاس، کمزوری سب کے سب جیسے ختم ہو گئے ہوں۔ اسے اپنے قوتِ بازو پر خود تعجب ہو رہا تھا۔ آدھے گھنٹے تک وہ اسی طرح بے خبری کی حالت میں ہاتھ چلاتا رہا حتیٰ کہ لکڑی درمیان میں سے دو ٹکڑے ہو گئی اور دکھی کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی اس کے ساتھ ہی وہ بھی چکر کھا کر گر پڑا، بھوکا، پیاسا اور تھکا ہوا جسم جواب دے گیا تھا۔

پنڈت جی نے پکارا، اٹھکر دو چار ہاتھ اور مار دے، پتلی پتلی لکڑیاں ہو جائیں، لیکن دکھی نہ اٹھا۔ اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ چکی تھی لیکن پنڈت جی کا ظلم ابھی تک اس کے جسم کو نہ چھوڑ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آئے اور دیکھا کہ دکھی اکڑا ہوا پڑا ہے۔ یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی کہ ایک چمار اچانک مر گیا۔ گاؤں برہمنوں کا تھا صرف ایک گھر گونڈ کا تھا لاش اٹھوانے کی فکر پنڈت جی کو نہ تھی۔ انھوں نے چماروں کی بستی میں کہلا بھیجا کہ لاش اٹھا لیجاؤ۔ دکھی کی بیوی اور لڑکی دونوں آئیں اور سر پیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ چمار بھی جمع ہوئے لیکن گونڈ نے کہا۔

خبردار مردہ اٹھانے مت جانا ابھی پولیس کی تحقیقات ہو گی۔ دلگی ہے کہ ایک غریب کی جان لے لی۔ پنڈت ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے لاش اٹھا لاؤ گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے"

پنڈت جی نے چماروں کو بہت دھمکایا، سمجھایا، منت کی، لیکن چماروں کے دل پر پولیس کا رعب چھایا ہوا تھا۔ ایک بھی ان کی بات کو نہ مانا اور پنڈت جی نا امید ہو کر لوٹ آئے۔

رات گذر گئی اور صبح بھی کوئی چمار نہ آیا چمارنی بھی مدد پیٹ کر چلی گئی۔ بدبو پھیلنے لگی۔ پنڈت جی نے ایک رسی نکالی اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گاؤں کے باہر گھسیٹ لے گئے اور وہاں سے آکر فوراً نہا لئے

اور ادھر کھیت میں دکھی کی لاش کو گیدڑ، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے اور یہ اس کی تمام زندگی کی بھگتی خدمت اور عقیدہ کا انعام تھا۔

آخری تحفہ ــــ سوالات وجوابات

(نثر)

سوال:۔ اردو افسانے کے متعلق آپ کیا جانتے ہو؟

جواب:۔ ہمارے مختصر افسانہ کے ابتدائی دور میں واضح طور پر داستان کی دلکش روایت کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار پریم چند کے مختصر افسانوں کے کئی ابتدائی مجموعے، سوز وطن، پریم پچیسی اور پریم بتیسی اور ان میں بھی نمایاں طور پر سوز وطن، ان کے ہم عصروں میں سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں خارستان و گلستان حیدر جوش کے اکثر اصلاحی افسانے اور نیاز فتحپوری کے افسانوں کا مجموعہ نگارستان اور اس میں بھی بالخصوص کیوپڈ اور سائکی اور الحمراء کا گلاب وغیرہ اس رنگین روایت کی نشانیاں اور یادگار ہیں۔

سوز وطن کے افسانوں میں دنیا کا سب سے انمول رتن اور شیخ مخمور کی فضا اور ماحول سرتاسر رومانی ہے۔ اس رنگین اور رومان انگیز فضا میں کرداروں کا مزاج ان کا جذباتی انداز فکر و نظر، گفتگو کا شاعرانہ اور پر تصنع اسلوب، کرداروں کی دلیرانہ اور حق پرستانہ سیرت، ان کے افعال و کردار پر غیر فطری جوش کا غلبہ۔ یہ سب کچھ بھی افسانے نے داستان کی روایت سے حاصل کیا اور اسے برقرار رکھا۔

ہمارے ابتدائی دور کے ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں مختلف حیثیتوں سے داستان کی قائم کی ہوئی فنی روایت کا جو گہرا عکس ہے. اس کے ساتھ ساتھ یہ سب تخلیقات کہانی کی ایک نئی صنف کی نقشِ اول بھی ہیں. ایسا نقش جس سے زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل بھی ہوتی ہے. اور افسانوی فن کی روایت میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ بھی ہوتا ہے افسانہ نگاروں نے کہانی سنانے اور قاری اور سامع کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے کی قدیم روش پر قائم رہ کر بھی کہانی کو فن کی حیثیت سے بعض نئی چیزیں دیں

افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا کسی ایک واقعے، ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک روحانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہوکر پڑھنے والے کے جذبات واحساسات پر اثر انداز ہو. افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے. جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے. مختصر افسانوں میں اختصار وایجاز کی دوسری امتیازی خصوصیت نے اس کے فن میں سادگی حُسن ترتیب و توازن کی ضرورت پیدا کی اور یہ سب چیزیں ہمیں پریم چند، سلطان حیدر جوش. سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کے افسانوں میں ملتی رہیں.

پریم چند، سلطان حیدر جوش. سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کی رکھی ہوئی بنیاد علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی حامد اللہ افسر اور فضل حق قریشی نے افسانوی فن کی ایک ایسی عمارت

کی تعمیر کی۔ جس میں زندگی کی حقیقتیں اور فن کی رعنائیاں دست بدست ایک دوسرے کو سہارا دیتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں نے افسانہ کو حقیقت و شعریت، صداقت و تخیل کے بجائے مشاہدہ کو اور شعریت کی جگہ غور و فکر کو اپنا رہنما بنایا ہے۔

۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے بعد سے البتہ افسانوں میں زندگی کے نقش نسبتاً زیادہ گہرے ہوتے نظر آئے۔ اس زمانے کے شدید معاشی اور سیاسی ہیجان و اضطراب نے ہر حساس انسان کے دل میں انسان اور انسانیت کی خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اسے ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنا فنی منصب سمجھنے کی طرف پہلی مرتبہ قدم اٹھایا۔ پریم چند نے اس معاملہ میں اپنے ہم عصروں کی رہنمائی کی اور زندگی کے گھمسان میں کود کر ایک سپاہی کی طرح ان قوتوں کو مٹانے کا تہیہ کیا۔ جن کے ہاتھوں انسانیت درد میں مبتلا تھی۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک ہمیں افسانہ نگاری ایک ایسے دور سے گذرتی دکھائی دیتی ہے جس میں افسانہ نگاروں نے زندگی کے صرف ان پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جن پر وہ پوری طرح حاوی تھے۔ افسانہ نگاروں نے زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے اور اس کے بھیدوں سے پوری طرح واقف ہونے کو اپنے فنی نصب العین کی پہلی منزل بنایا۔ پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی، اعظم کریوی، مجنوں گورکھپوری، سدرشن، راشد الخیری اور عظیم بیگ چغتائی ان سب کے افسانے صرف اس ماحول کے مصور ہیں جس پر ان کی نظر گہری ہے

زندگی سے اس قریب کے ساتھ فن کا احساس بھی ان سب افسانہ نگاروں کے یہاں اب تیز تر تھا۔

مختصر افسانہ کی تاریخ میں ۱۹۳۵ء کا سال ایک اہم سنگ میل ہے دنیا کے مختلف حصوں میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی لیکن ترقی پسندی تحریک کے منظر عام پر آنے سے پہلے سارے کئی افسانہ نگار ایسی چیزیں لکھ چکے تھے اور یہ مختلف افسانے ہیں۔ جنہوں نے غیر شعوری طور پر اُردو میں ایک بالکل نئے افسانوی ادب کی بنیاد ڈال دی تھی۔

اس قسم کے افسانوں کی سب نمایاں مثال پریم چند کا افسانہ "کفن" ہے۔ کفن۔ زندگی کے گہرے اور ہمدردانہ مشاہدے اور مطالعے، تخیل اور فکر کی متوازن آمیزش اور فن کے مخلصانہ احساس کے ربط و آہنگ کا مثالی نمونہ ہے۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک مختصر افسانہ کی زندگی کے شباب اور اس کے فنی عروج کا بہترین زمانہ ہے افسانہ کے اس عروج و شباب کے آغاز تک داستان اپنی زندگی پوری کر چکی تھی اور میر باقر علی داستان گو کی وفات نے اس بزم کی آخری شمع کو گل کر دیا تھا۔ ناول نے البتہ اس کی ترقی کی ساتھ ساتھ ارتقا کے بہت سے مراحل طے کئے اور پریم چند کی وفات تک دان ہی کے ہاتھوں) ناول اس بام عروج تک پہنچ چکا تھا۔ جس سے اونچا پریم چند کے بیش رو اسے نہیں لے جا سکے اور اسطرح گویا ۱۹۳۶ء تک فن کی حیثیت سے داستان کا وجود باقی نہیں رہا اور ناول کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکا اور اسطرح اب افسانوی ادب کی صرف ایک صنف (یعنی مختصر افسانہ)

پر یہ ذمہ داری آپڑی کہ وہ زندگی کی خدمت گزاری اور فن کی ناز برداری کے دوہرے منصب کو پورا کرے اور اس میں شبہ نہیں کہ ۱۹۳۶ء سے لیکر آج تک ہمارے مختصر افسانے نے یہ دونوں منصب اسطرح پورے کیئے کہ زندگی اور فن دونوں کیلیئے باعثِ ناز و افتخار ہیں۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی وغیرہ کافی نمایاں ہیں ان کے علاوہ موجودہ دور میں افسانہ نگاروں کی فہرست طویل ہے۔ اس لیئے صرف چند ہی کے نام کو بیان کیا گیا ہے۔

سوال :- اردو افسانہ میں حقیقت نگاری کا مادی تصور کیسے پیدا ہوتا ہے ؟

جواب :- حقیقت نگاری ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے مفاہیم و مطالب میں وقت، ماحول اور افکار و خیالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ حالات کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بدلتی رہی ہے۔ اس کی زندگی میں انقلاب آتے رہے ہیں اور اس نے وقت اور ماحول کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے یوں زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا بدلنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ لیکن سماجی حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ حقیقتوں کے تصورات کو بدلنا ہی پڑتا ہے کیونکہ خود سماجی تقاضے بدل جاتے ہیں۔ اور ظاہر ہے سماجی تقاضوں سے منہ موڑنا ان سے جی چرانا۔ آنکھ بچانا اور ان کو نظر انداز کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں چنانچہ انسانی زندگی کی تاریخ، فلسفہ اور فن و ادب کی تاریخ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ حقیقت نگاری

کے تصورات کم و بیش ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں. ایک زمانے میں ماورائی اور مابعد الطبیعاتی باتوں کو حقیقت سمجھا گیا ہے تو دوسرے زمانے میں زندگی کے مادی مسائل حقیقت نگاری کے تحت شمار کیے گئے ہیں. کسی زمانے میں مافوق الفطرت اور مافوق العادت تصورات کو حقیقت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تو کسی زمانے میں عقل و شعور سے متعلق باتیں، حقیقت نگاری سے عبارت سمجھی گئی ہیں اور اب یہ سلسلہ جاری ہے۔

اردو افسانوں میں بھی حقیقت نگاری کا ہر زمانہ میں کوئی ایک محدود اور مخصوص تصور نہیں ملتا۔ برخلاف اس کے حقیقت نگاری کے تصورات اردو افسانوں میں سماجی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہر زمانے میں بدلا کئے ہیں اور ان تصورات میں ایک کشمکش کا سلسلہ بھی جاری رہا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر زمانہ میں ایک مخصوص نقطۂ نظر کے علمبردار اپنی تخلیقات کو حقیقت سے ہم آہنگ سمجھتے رہے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا۔ جب غواصی، ابن نشاطی، وجہی اور نصرتی بھی اپنی مثنویوں کو حقیقت نگاری کے بہترین نمونے سمجھتے تھے میر حسن اور دیا شنکر نسیم کے نزدیک انکی مثنویاں، سحر البیان اور گلزار نسیم حقیقت نگاری کی بہترین مثالیں تھیں۔ طلسم ہوش رُبا اور بوستان خیال الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ، طوطا کہانی اور نوطرزِ مرصع، فسانہ عجائب اور باغ و بہار ان سب کے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے خیال میں حقیقتوں کے ایسے مرقعے تھے جن کی مثالوں کا کہیں اور ملنا مشکل تھا۔ اور اس کے بعد شرر نے اپنے تمام ناولوں کو اور سرشار اپنے

فسانۂ آزاد کو حقیقت پر مبنی سمجھتے تھے۔ نذیر احمد کے قصے اور...
راشد الخیری کی کہانیاں ان کے پڑھنے والوں کے خیال میں حقیقت نگاری سے بھرپور تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ موجودہ حالات کے پس منظر میں ان تمام تخلیقات کو دیکھا جائے تو وہ حقیقت کے موجودہ تصورات سے دور، نظر آئیں گی۔ لیکن جس ماحول میں ان کی تخلیق ہوئی ہے اس کے پس منظر میں وہ حقیقت سے پوری طرح ہم آہنگ معلوم ہوتی ہیں۔ ابن نشاطی غواصی، میر حسن اور دیاشنکر نسیم کی کہانیاں جن میں مافوق الفطرت عنصر غالب ہے۔ ان کو بھی حقیقت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اس زمانے کے لوگ ان ہی مافوق الفطرت باتوں کو حقیقت سمجھتے۔ اس لئے اگر ان لکھنے والوں نے ان توہمات کو پیش کیا تو یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں، البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دور ہی عقلیت کا دور نہیں تھا۔ پھر بھی اس میں وہ حقیقت نگاری کہاں ہے آئی جس سے بنیادیں عقلیت پر استوار ہوتی ہیں۔

یہ حقائق اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ حقیقت نگاری کے تصورات ماحول، حالات اور واقعات، عقائد و توہمات کے ہاتھوں صورت پذیر ہوتے ہیں۔ اور اسی لکھنے والے کو حقیقت نگار کہا جا سکتا ہے جو اس صورت حال کی روشنی میں نئی حقیقتوں کا پتہ لگائے۔ اس کے خیالات کی بنیادیں اگر عقلیت پر استوار ہوں اور حقیقتوں کی تلاش میں اگر وہ شعور کی روشنی سے کام لے تو پھر اس کے حقیقت نگار ہونے میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

یہاں مختصر افسانوں میں حقیقت نگاری کا جائزہ لینا مقصود ہے لیکن پس منظر کے طور پر اگر ہم حقیقت نگاری کی ان روایات کو سامنے رکھیں جو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اردو کے قصے کہانیوں میں بنتی رہیں تو مختصر افسانوں میں حقیقت نگاروں کے عناصر کو سمجھنے میں بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ اور اس طرح ان کا صحیح جائزہ لیا جا سکے گا۔

اردو کے قصے کہانیوں میں حقیقت نگاری کا مادی تصور اسی وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد زندگی کی پرانی اقدار دم توڑنے لگتی ہیں اور ایک نئی دنیا جنم لینے لگتی ہے۔ زندگی کے محراب میں ایک نیا چراغ روشن ہوتا ہے۔ ورنہ اس سے قبل تو سوائے مافوق العادت اور مافوق الفطرت باتوں کے اور کوئی بات لکھنے والوں کے ذہن میں آتی ہی نہیں تھی۔ اگر کوئی بہت آگے بڑھتا تو مابعد الطبعیاتی مسائل کو اس کی تخلیق میں جگہ مل جاتی تھی۔ اس لیے یہ اقدام حقیقت نگاری کے مادی تصور سے اردو افسانوں کو روشناس کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوا۔ اور اس نے ایک ایسی روایت قائم کر دی۔ جس کے سہارے اردو افسانہ نگاری نے حقیقت نگاری کے راستے پر زیادہ تیزی سے قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔

نذیر احمد کے ساتھ سرشار اور شرر بھی کم وبیش اسی زمرے میں آتے ہیں یہ اور بات ہے کہ نذیر احمد کی طرح سرشار شرر کسی ایسی تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔ جو ان میں ایک افادی میلانات پیدا کرتی پھر بھی ان کے یہاں حقیقت نگاری کا ایک شعور ملتا ہے اور اسی لئے آج وہ اردو

ادب میں زندہ جاوید ہیں۔

حقیقت نگاری کی یہ روایت بنی اور حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس میں زیادہ جان آگئی۔ اس نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے اور اس طرح اس کا بچپن جوانی میں تبدیل ہوتا گیا اور جب مختصر افسانہ اردو میں آیا تو حقیقت نگاری کی یہ روایت اس پر بھی اثر انداز ہوئی۔ چنانچہ اردو کا مختصر افسانہ ابتدا سے لیکر اس وقت تک حقیقت نگاری کے سہارے آگے بڑھتا رہا ہے۔ اور آج تو وہ حقیقت نگاری سے علیحدہ کوئی چیز ہی نہیں۔

مختصر افسانہ اردو میں مغرب کے زیر اثر آیا ہمارے یہاں اس فن کی کوئی جاندار روایت موجود نہیں تھیں۔ اس لئے مغربی مختصر افسانے کی ساری خصوصیات وہ اپنے ساتھ لایا۔ مغربی افسانے کی ایک نمایاں خصوصیت حقیقت نگاری رہی ہے۔ چنانچہ مغرب کے اثر نے اردو افسانوں میں حقیقت نگاری کی روایت کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے میں بڑی مدد کی۔ اب رومانیت تک میں زندگی کی جھلک نظر آنے لگی اس کا کھوکھلا پن ختم ہو گیا۔ اور اس پر جذباتیت کے جو بادل چھائے ہوئے تھے وہ چھٹنے لگے۔ چنانچہ اردو کے جدید مختصر افسانے کی رومانیت تک حقیقت سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ نیاز لطیف الدین احمد، سجاد حیدر یلدرم اس رومانیت کے علمبردار تھے لیکن ان کے ساتھ ساتھ اسی زمانے میں اردو میں بعض ایسے افسانہ نگار بھی سامنے آتے ہیں جن کے یہاں زندگی کا صحیح احساس اور بنیادی سماجی مسائل کا شعور بدرجہ اتم موجود تھا۔ ان میں پریم چند اور ان کے ساتھی تمام

طور پر قابل ذکر ہیں۔

پریم چند نہ صرف یہ کہ اردو مختصر افسانے کے بانی ہیں، بلکہ حقیقت نگاری کی ابتداء بھی اردو افسانوں میں انہیں کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ پریم چند کے یہاں زندگی کا صحیح احساس موجود ہے انہوں نے سماجی حالات کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اس کے مدوجزر کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنے وقت کی سیاسی اور سماجی تحریکوں کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ اور ان کی ترجمانی اور عکاسی میں پیش پیش رہے ہیں انہوں نے اپنے فن کو اس مقصد کیلئے وقف کر دیا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ان کے وقت کے ہندوستان کی سماجی زندگی کی ساری تصویریں نظر آتی ہیں۔ نظریات کے اعتبار سے وہ گاندھی جی کے پیرو تھے۔ ان کے خیال میں گاندھی جی کا پیام ہندوستان کے سارے مسائل کو حل کر سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسی خیال کے پیش نظر اپنی تمام تخلیقات کو گاندھی جی کے پیام کے لئے وقف کر دیا ہے۔ گاندھی جی کے پیام میں سماجی اصلاح دیہاتیوں کی بلندی گرے پڑے افراد سے ہمدردی، بدیسی آقاؤں کی غلامی سے نجات کے خیالات سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ پریم چند نے ان ہی تمام باتوں پر اپنی تخلیقات کی بنیادیں رکھی ہیں لیکن پریم چند کے افسانوں میں ان باتوں کی اہمیت ثانوی ہے اولیت ان میں حاصل ہے۔ اس زندگی اور ماحول کو جس سے یہ متعلق ہیں، پریم چند کا فن اسی وجہ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ عام طور پر زندگی اور اس کے مسائل کے ترجمان کہے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے

دیہاتی زندگی کے ساتھ ہندوستانی اور انسانی زندگی کی ترجمانی کی ہے۔ ان کے یہاں انسانی زندگی کی الجھنوں کا تذکرہ غالب ہے انسانی نفسیات کے بہترین نمونے ان کے فن میں نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانے انسان کے بنیادی جذبات واحساسات سے بھرپور ہیں اس لئے پریم چند کے افسانوں میں تو حقیقت نگاری اپنے شباب پر ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے وقت ماحول اور اس کے سیاسی وسماجی رجحانات کا ساتھ دیا ہے اور اسی سلسلے میں انسانی زندگی کے سارے مسائل کو اپنے افسانوں میں سمانے کی کوشش کی ہے اور یہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی پریم چند کو انہیں چیزوں نے ایک حقیقت نگار بنایا۔ ایسی حقیقت نگاری اُردو میں اس سے قبل موجود نہیں تھی۔ اسکو پیش کرنے میں انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔

(ملنے کا پتہ)

محسن بک ڈپو

موتی گلی چوک۔

حیدرآباد دکن ۲

(مطبوعہ)

اکسل فائن آرٹ پریس جامع مسجد چوک حیدرآباد ۲

فون ۵۳۳۱۳